علمی، ادبی، دینی، وتبلیغی رسالہ

جلد ۳۸

ماہنامہ

اذانِ بلال آگرہ

شمارہ: ۳، ۴

شعبان المعظم، رمضان المبارک ۱۴۴۷ھ مطابق مارچ، اپریل ۲۰۲۶ء

مدیر: ابوالبرکات مظاہری

بیادگار

حضرت مولانا مفتی محمود الحسن گنگوہیؒ

سرپرست

حضرت مولانا بلال عبدالحی حسنی ندوی

ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ

موبائل نمبر: 9557358285

9411401142

فون: ۰۵۶۲-۲۵۲۰۷۴۸

زرتعاون ہندوستان سے

فی شمارہ............۲۵/روپے

سالانہ..........۲۵۰/روپے

خصوصی........۲۰۰۰/روپے

سہ سالہ.........۷۵۰/روپے

لائف ممبری....۱۰۰۰۰/روپے

بیرون ممالک

۵۰/امریکی ڈالر کے مساوی

مجلس ادارت

اساتذۂ دارالعلوم آگرہ

اس دائرہ میں سرخ نشان علامت ہے کہ آپ کی مدتِ خریداری ختم ہوگئی، آئندہ کے لئے براہِ کرم رقم ارسال فرمادیں

خط وکتابت کا پتہ: منیجر ”اذان بلال“ دارالعلوم آگرہ محلّہ پیر جیلانی آگرہ-۴

اس شمارے میں

صفحہ	مضمون نگار	فہرست مضامین	نمبر شمار
۵	حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ	خلافت تجوید	ا
۱۷	حضرت مولانا ابوالحسن علی میاں ندویؒ	شیخ عبدالقادر جیلانی کا......	۲
۲۴	حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ	مذہب اور قومیت کے اثرات	۳
۲۸	حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب	اسلام اور ٹریفک	۴
۳۴	حضرت مولانا مفتی احمد صاحب خانپوری	فقہ وفتاویٰ	۵
۴۰	حضرت مولانا پیر ذوالفقار نقشبندی	محنت وریاضت	۶
۵۳	مولانا عبدالاحد ازہری	مومن فقط احکام الٰہی کا ہے پابند	۷
۵۸	ادارہ	خبرنامہ	۸

Printed at : Rabbani Printers Katra Sheikh Chand Lal Kuan Delhi.110006
Published by:Abul Barakaat Mazahiri Darul Uloom Agra Peer Jilani Agra-4.

مضمون نگار کی ہر بات سے ادارہ ''اذان بلال'' کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔ ادارہ

پرنٹر پبلیشر ابوالبرکات مظاہری نے ربانی پرنٹرس کٹرہ شیخ چاندلال کنواں دہلی سے چھپوا کر ''دفتر اذان بلال'' دارالعلوم آگرہ محلہ پیر جیلانی آگرہ نمبر۔۴۔ یوپی (انڈیا) سے شائع کیا۔

قسط اول

خلافتِ تجوید

حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ

جوہرِ دنیا

بزرگانِ محترم!

یہ دنیا دو چیزوں سے آباد ہے وہی دو چیزیں اس دنیا کا جوہر اور روح ہیں۔ایک اللہ کا کام اور ایک اللہ کا کلام۔

ایک طرف آپ کے سامنے یہ دنیا کھڑی ہوئی ہے۔زمین کا فرش بچھا ہوا ہے، آسمان کا خیمہ اوپر تنا ہوا ہے، آسمان میں سورج اور چاند کے انڈے روشن ہیں۔جن سے اس دنیا میں روشنی اور جگمگاہٹ ہے۔مختلف قسم کے جاندار اور بے جان مخلوق اس میں آباد ہے اور بس رہی ہے۔یہ سب چیزیں اللہ کا کام ہیں۔یہ اس کی صنعت اور صناعی اور کاریگری ہے جو آپ کے سامنے کھڑی ہوئی ہے۔یہ سب چیزیں فی الحقیقت اللہ کے انعامات اور اس کے تبرکات ہیں۔سورج اور چاند بھی اللہ کا ایک عطیہ اور تبرک ہے۔زمین اور آسمان بھی اللہ کا ایک عطیہ اور تبرک ہے۔لیکن ان میں سے

کوئی چیز بھی اللہ کے اندر سے نکل کر نہیں آئی۔ اللہ کے پیدا کئے ہوئے سے پیدا ہوئی ہے، لیکن خدا کے اندر سے نکل کر نہیں آئی، اس نے ایک معدوم شئی کو وجود دیا۔ تخلیق کی، پیدا کیا اور نمایا فرمادیا تو اس کی ایجاد سے ہی یہ ساری چیزیں آپ کے سامنے موجود ہیں۔

امتیازی عطیہ

لیکن وہ تبرک اور عطیہ جو اللہ کے اندر سے نکل کر آیا ہے اس کے باطن سے نکل کر ظاہر ہوا، اور آپ کے سامنے آیا وہ اللہ کا کلام ہے۔

تو یہ ساری چیزیں مخلوق کہلائیں گی۔ لیکن کلام مخلوق نہیں ہوسکتا۔

جب آپ کوئی چیز بناتے ہیں، تو آپ کہتے ہیں کہ میں نے یہ چیز بنائی، میں نے عمارت بنائی، چارپائی بنائی، برتن بنایا۔ لیکن جب کلام کرتے ہیں تو یوں نہیں کہا کرتے ہیں کہ میں نے اپنے کلام کو بنایا، یا میں نے اپنے کلام کو پیدا کیا۔ بلکہ یہ کہتے ہیں کہ میں نے کلام کیا، تو کلام متکلم کے اندر سے سرزد ہوتا ہے، صادر ہوتا ہے، بنایا نہیں جاتا۔ باہر کی چیز بنائی جاتی ہے۔ جس کو وجود دیا جاتا ہے۔ تو یہ زمین اور آسمان اللہ کے اندر سے نکل کر نہیں آئے، اس کے پیدا کئے سے پیدا ہوگئے۔ اور نمایاں ہوگئے۔ لیکن کلامِ خداوندی خود اس کی ذات میں سے نکلا ہے، اور نکل کر ہمارے سامنے آیا۔ تو سب سے بڑا تبرک اور عطیہ جو بلا واسطہ اللہ کے اندر سے نکل کر آیا، وہ آج

مسلمانوں کے ہاتھ میں موجود ہے۔

امتیازِ مسلم

تو یہ ایک مسلمانوں کا امتیاز اور خوش قسمتی ہے کہ براہِ راست عطیۂ خداوندی اور تبرکِ الٰہی ان کے ہاتھ کے اندر موجود ہے۔ اللہ کے اندر سے نکلا اور ان کے اندر داخل ہو گیا۔ اسی واسطے حدیث میں نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

تبرک بالقرآن فانه کلام الله وخرج منه

قرآن سے برکت حاصل کرو۔ اس لیے کہ وہ اللہ کا کلام ہے۔ اور اس کے اندر سے نکل کر آیا ہے۔

کلامِ خداوندی یوں تو رات بھی ہے۔ انجیل اور زبور بھی ہے لیکن حقیقی معنی میں کلام وہ ہوتا ہے جس سے تکلم کیا جائے اور بولا جائے۔ تورات سے حق تعالیٰ بولے نہیں بلکہ الواح لکھ کر موسیٰ علیہ السلام کے پاس بھیج دیں۔ اسی طرح انجیل بھی کلامِ خداوندی ہے مگر اس کا تکلم واقع نہیں ہوا۔ عیسیٰ علیہ السلام کے قلبِ مبارک پر اس کا الہام کر دیا گیا۔ الفاظ منزل من اللہ نہیں ہیں۔ مضمون حق تعالیٰ کا ہے۔ عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے مبارک الفاظ میں اسے پڑھ کر سنایا۔ اسی طرح سے زبور کے ساتھ بھی تکلم واقع نہیں ہوا۔

امتیازی کتاب

قرآن کریم کی یہ خصوصیت ہے کہ اللہ نے اس کا تکلم کیا۔ اسے پڑھ کر سنایا۔ اسی واسطے قرآن کریم میں قراءت کی نسبت اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف کی، تلاوت کی نسبت بھی اپنی طرف کی۔ اور تکلم کی نسبت بھی اپنی طرف کی۔ فرمایا:

فاذا قر انٰه فاتبع قرآنه

جب ہم قرآن کریم کی قراءت کریں تو اے رسول! سنتے رہو اور اس کی پیروی کرو۔

کہیں فرمایا:

نتلوا علیک من نبأ موسیٰ وفرعون بالحق.

اے پیغمبر! ہم آپ کے اوپر تلاوت کرتے ہیں موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ اور فرعون کا قصہ۔

بہر حال حق تعالیٰ نے اپنے آپ کو تالی اور تلاوت کنندہ بھی کہا اور قاری بھی اپنے کو کہا اور حافظ بھی اپنے کو کہا۔ فرمایا:

انا نحن نزلنا الذکر وانا له لحافظون.

اور ہم نے ہی یہ کلام اتارا ہے، اور ہم اس کے حافظ اور نگہ بان ہیں۔

تو حافظ بھی وہ ہیں، قاری بھی وہ ہیں، اور تلاوت کرنے والے بھی وہ ہیں۔

تو یہ خصوصیت قرآن کریم کی ہے کہ اس کی تلاوت بھی اللہ کی طرف سے واقع ہوئی ہے، اس کا تکلم بھی ان کی طرف سے واقع ہوا، اس کی قراءت بھی ان کی طرف سے واقع ہوئی۔

صوتِ سرمدی

کلام کے لیے بہر حال کچھ آواز کی ضرورت پڑتی ہے۔ تو نبی کریم ﷺ سے جب پوچھا گیا کہ

کیف یاتیک الوحی یا رسول الله؟

یارسول اللہ آپ پر وحی کس طرح سے آتی ہے؟ کیا کیفیت ہوتی ہے؟

تو آپ نے ارشاد فرمایا:

یاتینی مثل صلصلة الجرس

میرے اوپر وحی اس طرح سے آتی ہے جیسے گھنٹہ بجا کر جب چھوڑ دیا جاتا ہے، تو اس میں

ایک قسم کی گونج ہوتی ہے جو کئی منٹ تک اس کی آواز آتی رہتی ہے۔ میں ایسی ایک گونج سنتا ہوں۔کہیں فرمایا چکنے پتھر کے اوپر اگر ایک لوہے کی زنجیر ڈال کر اسے کھینچا جائے تو ایک مسلسل جھنجھناہٹ پیدا ہوتی ہے، میں اس قسم کی آواز سنتا ہوں جس سے واضح ہوتا ہے کہ قرآن کریم کی تلاوت میں کسی قسم کی صوت اور آواز کا بھی دخل ہے۔اگر چہ اس کی کفیت ہم نہیں بیان کر سکتے۔ مگر بہر حال تکلم کے لیے صوت ہوتی ہے۔تو صوتِ سرمدی کے ساتھ قرآن کریم سنایا گیا۔

عظمتِ کلام

جبریل علیہ السلام نے اولاً کلام کو سنا

حدیث میں ہے کہ جب حق تعالیٰ وحی فرماتے تو اس کی ہیبت اور عظمت سے تمام ملائکہ پر غشی طاری ہو جاتی ہے۔خود جبریل علیہ السلام پر بھی اس کی ہیبت وعظمت اور جلال سے غشی طاری ہوتی تھی۔ سب سے پہلے حضرت جبریل علیہ السلام افاقہ پاتے تھے، اس کے بعد دوسرے ہوش میں آتے تھے۔تو ملائکہ پوچھتے تھے۔

ماذا قال ربنا؟ کیا فرمایا ہمارے پروردگار نے؟

قال الحق وهو العلى الكبير۔کہتے حق فرمایا اور وہ علی وکبیر ہے۔

خلافت تجوید وقراءت

اس سے واضح ہوتا ہے کہ کوئی کلام جبریل علیہ السلام سنتے تھے اس سماع کی ہیبت سے ہی غشی طاری ہوتی تھی تو تکلم کے ساتھ صوت اور آواز واقع ہوتی ہے، جب آواز عظیم اور ہیبت ناک ہوتی ہے تو اس کی ہیبت سے ضروری ہے کہ غشی طاری ہوتی ہے۔ اگر گرج زور سے ہو جائے تو یقیناً دل دہل جاتے ہیں اور بعض دفعہ آدمی بے ہوش ہو جاتا ہے۔

آدمی تو آدمی آواز جب زوردار آتی ہے تو اس سے پہاڑ تک شق ہو جاتے ہیں، عمارتیں

گر جاتی ہیں، مکانات گر پڑتے ہیں۔ تو قرآن کریم کی آواز جب سنائی دیتی تھی تو ملائکہ جیسی طاقت ور مخلوق بھی ہیبت زدہ ہو کر بے ہوش ہو جاتی تھی۔

بہر حال قرآن کریم کی تلاوت واقع ہوئی اور تکلم واقع ہوا اور کوئی خاص قسم کی آواز بھی تھی جس سے تکلم ہوتا تھا۔ جس کو ملائکہ سنتے تھے، اور بعض اوقات، نبی کریم ﷺ نے بھی سنا۔ تو قرآن کریم میں ایک طرف الفاظ ہیں، ایک طرف اس کے معانی ہیں، اور ایک اس کا تکلم اور لب ولہجہ ہے۔ الفاظ کی حفاظت حفاظ نے کی ہے۔ بجنسہ آج اس کا ایک ایک لفظ، اس کا ایک ایک اعراب اور ایک ایک نقطہ محفوظ ہے، اور لکھا پڑھا موجود ہے۔ بعض قرآن کریم چھاپے گئے ہیں جن میں رکوعات کی تعداد، اور سورتوں کی تعداد، حروف کی اور لفظوں کی تعداد اور زیر وزبر کی تعداد تک لکھ دی گئی ہے۔ اس کو حفاظ نے محفوظ کیا۔ اس کے معانی کی علماء اور فقہاء نے حفاظت کی، اس کو اللہ تعالیٰ نے جو قانونی حیثیت دی تھی، اس کو علماء نے سمجھا۔ اس کے لب ولہجہ اور طرزِ ادا کی قراء اور مجودین نے حفاظت کی۔

جناب رسول اللہ ﷺ نے حق تعالیٰ سے سنا، جبریل علیہ السلام سے سنا تو ایک خاص لب و لہجے سے سنا۔ اسی لب و لہجے سے پھر آپ نے تلاوت فرمایا۔ اور اپنے صحابہؓ کو آپ نے سکھلایا۔ اس میں سے بہت سے قراء اور مجودین ہیں ان مجودین نے سنا اور سن کر دوسروں کو سنایا اور سکھلایا۔ تو قرآنِ کریم کی طرزِ ادا کی مجودین نے حفاظت کی۔ اگر الفاظ میں حفاظ خلفاءِ خداوندی ہیں، اور معانی میں اگر خلفاء الٰہی علماء ہیں تو اصوات اور طرزِ قراءت میں خلفاءِ ربانی قراء اور مجودین ہیں جنہوں نے طرزِ ادا کی حفاظت کی۔ اس کے رسم الخط کی حفاظت کی۔ وہ اسی انداز میں آج بھی لکھا جاتا ہے جس انداز میں قرنِ اول میں لکھا گیا۔ مثلاً آپ الرحمٰن لکھیں گے تو یہ لکھنا مکروہ اور ممنوع ہے کہ میم کے ساتھ الف ملا کر ''الرحمان'' لکھا جائے میم کے ساتھ نون ملا کر لکھیں گے اور میم پر کھڑا زبر دے دیں گے۔ یہ اصل رسم الخط ہے۔ تو اسی طرح پورے رسم الخط کی حفاظت کی گئی ہے۔ علماءِ رسم الخط نے اس کے قواعد منضبط کئے اور اس کو ایک فن کی صورت دی۔ تو پورے ایک طبقے نے اس کی حفاظت کی۔

اس کی حکمتوں کی حفاظت حکماءِ اسلام نے کی۔ اس کے اندر تاریخ کے جتنے جملے موجود ہیں، ان کی تفصیلات مورخین نے کیں۔ اس میں جتنے حقائق موجود ہیں، ان کو صوفیاء کرام رضی اللہ عنہم اجمعین نے منضبط کیا۔ تو قرآن کریم کے ایک ایک پہلو کی حفاظت کے لیے مستقل ایک ایک طبقہ کھڑا ہو گیا۔ الفاظ کے لیے حفاظ، معانی کے لیے علماء، رسم الخط کے لیے علماء رسم الخط، آواز اور طرزِ ادا کے لیے قراء اور مجودین، حکم اور مصالح کے لیے حکماء، حقائق کے لیے صوفیا، اور علل و اسرار کے لیے فقہاء تو ایک ایک طبقے نے ایک ایک پہلو کی حفاظت کی۔ اسی طرح سے قرآن کریم محفوظ ہوا۔

انا نحن نزلنا الذکر وانا له لحٰفظون.

ہم ہی نے قرآن اتارا ہے اور ہم اس کی حفاظت کے ذمہ دار ہیں۔

امتیازی حفاظت

تو حقیقی حفاظت تو حق تعالیٰ شانہ نے کی ہے۔ لیکن اللہ کی جتنی صفات اور کمالات ہیں، وہ اس دنیا میں بذیل اسباب نمایاں ہوتے ہیں۔ خالق بلاشبہ حق تعالیٰ ہیں لیکن تخلیق مرد و عورت کے ملنے سے واقع ہوتی ہے تو سببِ تخلیق مرد و عورت ہیں اور خالق حق تعالیٰ ہیں۔ ماں باپ کو خالق نہیں کہا جائے گا، سبب تخلیق کہا جائے گا۔ رزّاق بلاشبہ حق تعالیٰ ہیں لیکن رزق رسانی کا ذریعہ زمین کو بنایا، اس سے غلہ اگتا ہے، کاشت کار اس میں محنت کرتا ہے تو کاشت کار ظاہر میں محنت کرتا ہے۔ حقیقت میں کاشتکاری حق تعالیٰ فرماتے ہیں جیسا کہ قرآن کریم میں فرمایا۔ ء

انتم تزرعونه ام نحن الزارعون.

تم زراعت کرتے ہو کہ ہم زراعت کرتے ہی؟

تم نے تو بیج ڈال دیا، اس بیج کی منوں مٹی کے نیچے حفاظت کرنا، اس میں سے کونپل نکالنا،

کونپل میں مادے اور جوہر رکھنا، پھر اس کونپل میں دانہ پیدا کرنا، یہ کاشت کار کا کام ہے یا ہمارا کام ہے؟ تو محض دانہ ڈال دینا یہ کاشت نہیں ہے۔ اس میں سے بنانا، بنا کر درخت نکالنا، درخت میں سے پھل نکالنا، اصل کاشت کاری یہ ہے تو فرماتے ہیں۔

ء انتم تزرعونه ام نحن الزارعون.

تم زراع اور کاشت کار ہو کہ ہم کاشت کار ہیں؟ ہم کھیتی کرتے ہیں کہ تم کرتے ہو؟ اور فرمایا:

ء انتم تخلقونه ام نحن الخٰلقون.

تم خالق ہو کہ ہم خالق ہیں؟ تمہارا کام اتنا ہے کہ نر و مادہ مل گئے۔ رحمِ مادر میں کیا ہو رہا ہے؟ کس طرح سے مخلوق بنائی جارہی ہے؟ کس ترتیب سے اسے ابھارا جارہا ہے؟ یہ تو کرنے والا جانتا ہے، وہی کرتا ہے اور اس ماں کو خبر نہیں جس کے پیٹ میں یہ سارس مشینری چل رہی ہے اور کارخانہ چل رہا ہے۔ تو اس اندھیری کوٹھری میں پانی کے اوپر نقاشی کرنا یہ اسی صانع حکیم کا کام ہے جس کی قدرت لامحدود ہے۔

اسی طرح سے کلام کو تکلم کرنا، فرمایا تم تکلم کرتے ہو، ظاہر میں تم ہو مگر حقیقت میں کلام ہمارا ہوتا ہے۔ حفاظت بظاہر تم کرر ہے ہو، مگر حقیقت میں ہم قاری ہیں جو قرآن کریم کی قراءت کرر ہے ہیں۔ تو حفاظتِ خداوندی بذیل اسباب نمایاں ہو رہی ہے۔

آج کے دور میں جب کہ قرآن کریم کی طرف لوگوں کی توجہ نہیں ہے یعنی سو میں سے ایک دو کی ہے۔ مجموعی طور پر قوم متوجہ نہیں ہے۔ جیسا کہ توجہ کا حق ہے قرآن کی تعلیم پر کوئی مادّی وعدہ نہیں ہے کہ آپ نے اگر قرآن پڑھ لیا تو آپ کوئی بڑا عہدہ مل جائے گا۔ یا قرآن پڑھ لیا تو چند لاکھ روپے آپ کو مل جائیں گے یا کوئی جاگیر مل جائے گی؟ کوئی اس قسم کا وعدہ نہیں۔ اس کے باوجود یہ دارالعلوم کس طرح سے قائم ہے؟ یہ حافظ خانے کس طرح سے قائم ہیں؟ ہزاروں آدمی کیوں چلے آرہے ہیں؟ یہ محض قرآن کا معجزہ ہے کہ کوئی وعدہ نہیں اور دلوں پر دباؤ بڑھ رہا ہے کہ آؤ پڑھو اور پڑھاؤ۔ بظاہر اس

میں کوئی دنیوی مفادنہیں ہے۔ پھر بھی آنے پر مجبور ہیں۔ یہ وہی حفاظتِ خداوندی ہے کہ دلوں میں ڈالا جارہا ہے۔ وہ آرہے ہیں اور پڑھ رہے ہیں۔ اور قرآن کی حفاظت ہورہی ہے۔

پھر حفاظت بھی چھوٹے بچوں سے کرائی جارہی ہے۔ عموماً قرآن کریم پڑھنے والے چھوٹے بچے ہی ہوتے ہیں۔ بڑے آدمی اگر پڑھتے تو یہ تہمت آسکتی تھی کہ وہ حفاظتِ قرآن کی غرض سے پڑھ رہے ہیں اور ان کی طرف حفاظت منسوب ہوتی کہ اگر یہ عقلاء اور بڑے بوڑھے متوجہ نہ ہوتے تو قرآن محفوظ نہ ہوسکتا۔ تو وہ اگر حفاظت کرتے تو ان کے ارادے کی طرف نسبت ہوتی کہ انہوں نے کچھ سوچ سمجھ کر حفاظت کی ہے۔ لیکن بچوں سے حفاظت کرائی جارہی ہے۔ جنہیں یہ بھی خبر نہیں کہ اس کے پڑھنے سے فائدہ کیا ہے؟ اور حفاظت ہورہی ہے تاکہ اس کی حفاظت کی نسبت خالص اللہ کی طرف ہو کہ وہ حفاظت کرنے والے ہیں، بچے حفاظت کرنے والے نہیں ہیں۔ تو بڑوں کے ذریعے حفاظت کی نسبت ان کی طرف ہوتی ہے جس سے تہمت آتی۔ اس لیے عادت اللہ یوں چلی کہ چھوٹے چھوٹے بچے پانچ پانچ، چھ، چھ اور سات سات برس کے جن کے سینوں کے اندر قرآن کریم محفوظ ہے۔ تاکہ یہ حفاظت براہِ راست اللہ کی حفاظت سمجھی جائے۔ بہر حال فرمایا گیا

انا نحن نزلنا الذكر وانا له لحفظون.

ہم نے ہی یہ قرآن اتارا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کے ذمہ دار ہیں۔ تو حقیقی حفاظت حق تعالیٰ شانہ کی طرف سے ہورہی ہے۔

حفاظت بطریقِ حفظ

اور اس کے ایک ایک پہلو کی حفاظت کے لیے ایک ایک مستقل طبقہ کھڑا ہوگیا جس نے حفاظت کی۔ تو یہ قراء اور مجودین بھی فی الحقیقت قراءت کے اندر خلفاءِ خداوندی ہیں۔ ان کی سند بھی جاکر اللہ تعالیٰ ہی کی طرف پہنچتی۔

اسلام کی یہ خصوصیت ہے کہ اس میں ہر چیز استناد کے ساتھ ہے۔ قرآن کریم ہے، حدیث، فقہ ہے، اصولِ فقہ ہے۔ سب چیزیں سند کے ساتھ ہیں۔ حدیث کے ایک ایک لفظ اور ایک ایک ٹکڑے کی سند ہم سے لے کر نبی کریم ﷺ تک پہنچتی ہے۔ ایک ذرا سا جملہ آپ روایت کریں گے اس کی سندِ نبی کریم ﷺ تک پہنچ جائے گی۔ محدثین نے حدیث کے راویوں میں سے چار لاکھ راویوں کی تاریخ مدون کردی۔ ان کا کریکٹر، ان کا کردار، ان کا حافظہ، ان کا ضبط، ان کی عدالت اور ان کے نام ونسب محفوظ کردیئے کہ یہ راویان حدیث ہیں۔ اسی طرح سے قرآن کریم کی حفاظت سند کے ساتھ کی گئی ہے۔ یہ جتنے قراء اور مجودین ہیں، ان کو سند دی جاتی ہے۔ مثلاً میں نے خود مولانا قاری عبدالوحید صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے قرآن کریم پڑھا۔ اور تجوید کے ساتھ پڑھا تو ان کی سند میرے پاس محفوظ ہے۔ تو مجھے قاری عبدالوحید صاحب نے پڑھایا۔ ان کو قاری عبدالرحمٰن صاحب الہٰ آبادی نے پڑھایا، ان کو قاری عبداللہ صاحب مکی نے پڑھایا، ان کو قاری ابراہیم رشید مصری نے پڑھایا، اور پھر آگے ان کے استاذ، یہاں تک کہ نبیِ کریم ﷺ تک سند پہنچ گئی۔ اور نبی کریم فرماتے ہیں کہ میں نے اس کو بواسطہ جبریل حق تعالیٰ سے حاصل کیا۔ اور جبریل کہتے ہیں کہ میں نے براہِ راست حق تعالیٰ سے سنا۔ تو ایک قاری کی سند اللہ تک پہنچ جاتی ہے۔ تو جس طرح سے قرآن کریم کے الفاظ کی سند محفوظ ہے اسی طرح سے اس کے لب و لہجے کی سند بھی محفوظ ہے اس کے معانی اور علوم کی بھی سند محفوظ ہے اس کے کلام کے جتنے پہلو ہیں وہ سب سند کے ساتھ محفوظ ہیں، ایک ایک نقطہ تک اس کا حفاظت کیا گیا ہے۔ تو فرمایا:

انا نحن نزلنا الذکر وانا له لحفظون

ہم نے اس کو نازل کیا، ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔

تو حفاظت کا یہی طریقہ ہوتا ہے کہ زبان سے پڑھا جائے یا لکھا جائے تو حق تعالیٰ کی طرف سے تکلم بھی واقع ہوا اور لکھا بھی گیا۔

حفاظت بطریق کتابت

حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ قرآن کریم سب سے پہلے لوحِ محفوظ کے اوپر لکھا گیا ہے۔ جیسا کاتب ہے ویسی ہی اس کی کتابت ہے۔ ویسے اس کے حروف ہیں۔ بعض سیر کی روایتوں میں ہے کہ لوحِ محفوظ میں قرآن کریم لکھا گیا۔ اور اس کا ایک ایک حرف کوہِ قاف کے برابر ہے۔ تو جیسا اس کا لکھنے والا ہے ویسے ہی اس کے حروف ہیں۔ جبریل علیہ السلام نے لوح محفوظ کو دیکھ کر قرآن حفظ کیا۔ پھر اسی قرآن کو حضرت اسرافیل علیہ السلام کی پیشانی پر لکھا گیا یہ گویا ان پر انعام کیا گیا۔ تو اسرافیل علیہ السلام کی پیشانی پر اور لوحِ محفوظ میں بھی درج ہے۔ اور جبریل علیہ السلام کے قلب میں درج کیا گیا اس کے بعد میں پھر بیت العزت میں قرآن اتارا گیا۔ یہ آسمانِ اول کے اوپر یعنی آسمانِ دنیا میں ایک مقام ہے۔ پورا قرآن آسمانِ دنیا کے اوپر بیت العزت میں اتار دیا گیا۔ اور وہاں سے پھر تیئیس برس میں رفتہ رفتہ نبی کریم ﷺ کے اوپر نازل ہوا۔ ایک ایک آیت، دودو آیت حسب موقع حسب واقعہ اترتی گئی۔ تو گویا اللہ سے چلا لوحِ محفوظ تک آیا۔ پھر جبریل تک آیا، پھر بیت العزت میں آیا، پھر نبی کریم ﷺ تک پہنچا۔

حفاظتِ بطریق تواتر

اور نبی کریم ﷺ نے اپنے صحابہؓ کو بڑھایا، صحابہؓ نے تابعینؒ کو پڑھایا۔ تو قرآن کریم میں تواتر بھی طبقہ کا ہے۔ ایک تو ضابطہ کا تواتر ہوتا ہے۔ حدیثِ متواتر اس کو کہتے ہیں جس میں کم سے کم تین تین آدمی روایت کرتے چلے آ رہے ہوں۔ اور اخیر تک تین کا عدد محفوظ رہے۔ بہرحال تین ہو یا تین سے زیادہ۔ اور اخیر تک تین کا عدد محفوظ رہے۔ یہ اعلیٰ ترین تواتر سمجھا جاتا ہے۔ لیکن قرآن کریم میں تین تین کا نہیں بلکہ ہزاروں ہزار کا ہے۔ ہر قرن میں ہزاروں لاکھوں حافظ رہے۔ ہر قرن کے اندر ایک طبقے نے دوسرے طبقے سے سنا۔ دوسرے نے تیسرے سے سنا۔ اس طرح سے سند چلی۔

محیط بالدیانت کتاب

تو مروی عنہ، جس سے روایت کی گئی وہ حق تعالیٰ شانہ ہیں۔راویٔ اول وہ جبریل علیہ السلام ہیں۔ پھر حفاظت کے ساتھ جناب نبیٔ کریم ﷺ کے قلبِ مبارک پر اس کو اتارا گیا۔ جس کو ایک جگہ ارشاد فرمایا گیا۔

وانہ لتنـزیل رب العلمین. نزل به الروح الامین. علی قلبک لتکون من المنذرین.

یہ اللہ رب العزت کا نازل کردہ ہے۔ اس کو لے کر روح الامین نازل ہوئے۔ اور قلب محمدی کے اوپر لے کر آئے۔

حق تعالیٰ شانہ کی صفت اس کے اسماء میں سے امین ہے کہ وہ امانت والا ہے۔ حضرت جبریل کی صفتِ روح الامین، وہ خود امانت والے۔ اور نبی کریم ﷺ کی صفتِ محمد الامین ہے کہ امانت والے۔ اور یہ امانت کا لفظ وہ تھا جس کو اپنوں نے ہی نہیں بلکہ غیروں نے بھی تسلیم کیا۔ نبوت سے پہلے تمام کفارِ مکہ آپ کو امین کے لقب سے یاد کرتے تھے۔ جب آپ آتے تو کہتے

جاء محمدن الامین

امانت والا آ گیا۔

تو کلام امین سے چلا، امین لے کر آیا، اور امین کے قلب پر اترا۔ تو امانت کے ساتھ اوپر نیچے تک پہنچ گیا۔ سند میں یہی دیکھا جاتا ہے کہ راوی اور مروی عنہ پوری عدالت لیے ہوئے ہوں، پورا ضبط لیے ہوئے ہوں، پوری امانت داری کے ساتھ پہنچائیں۔ تو اللہ سے بڑھ کر امانت والا کون ہوسکتا ہے؟ اور جبریل علیہ السلام سے بڑھ کر امین کون ہوسکتا ہے؟ اور خاتم النبیین سے بڑھ کر انسانوں میں امانت والا کون ہوسکتا ہے؟ تو تین امینوں کے اندر یہ کلام رہا پھر سند کا سلسلہ چلا۔

☆☆☆

قسط آخر

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کا اصلاحی وانقلابی کام

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ

دنیا کی صحیح حیثیت

حضرت شیخ کے یہاں رہبانیت کی تعلیم نہیں، وہ دنیا کے استعمال اور اس سے بقدر ضرورت انتفاع سے منع نہیں فرماتے، اس کی پرستش اور غلامی اور اس سے قلبی تعلق اور عشق سے منع فرماتے ہیں، ان کے مواعظ درحقیقت حدیث نبوی "**ان الدنیا خلقت لکم وانکم خلقتم للآخرة**" بے شک دنیا تمہارے لیے پیدا کی گئی (یعنی تمہاری لونڈی ہے) اور تم آخرت کے لیے پیدا کئے گئے کی تفسیر ہیں۔ ایک موقع پر فرماتے ہیں:

"دنیا میں سے اپنے مقسوم اس طرح مت کھا کہ وہ بیٹھی ہوئی ہو اور تو کھڑا ہو، بلکہ اس کو بادشاہ کے دروازہ پر اس طرح کھا کہ تو بیٹھا ہوا ہو، اور وہ طباق اپنے سر پر رکھے ہوئے کھڑی ہو، دنیا خدمت کرتی ہے، اس کی جو حق تعالی کے دروازہ پر کھڑا ہوتا ہے، اور جو دنیا کے دروازہ پر کھڑا ہوتا ہے، اس کو ذلیل کرتی ہے، حق تعالی کے ساتھ عزت وتونگری کے قدم پر۔"

ایک دوسرے موقع پر ارشاد ہوتا ہے:

دنیا ہاتھ میں رکھنی جائز، جیب میں رکھنی جائز، کسی اچھی نیت سے اس کو جمع رکھنا جائز باقی قلب میں رکھنا جائز نہیں (کہ دل سے محبوب سمجھنے لگے) دروازہ پر اس کا کھڑا ہونا جائز باقی دروازہ سے آگے گھسنا نا جائز ہے نہ تیرے لیے عزت ہے۔"

خلفاء اور حکّامِ وقت پر تنقید

حضرت شیخ صرف مواعظ، پند ونصیحت اور ترغیب وتشویق ہی پر اکتفا نہیں فرماتے تھے،

جہاں ضرورت سمجھتے تھے، بڑی صاف گوئی اور جرأت کے ساتھ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دیتے، حکام وسلاطین اور خلیفۂ وقت پر تنقید اور ان کے غلط افعال اور فیصلوں کی مذمت سے بھی باز نہیں رہتے تھے، اور اس بارے میں کسی کی وجاہت اور اثر ونفوذ کی مطلق پروا نہیں کرتے تھے، حافظ عماد الدین ابن کثیر اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں:

کان یامر بالمعروف وینھی عن المنکر للخلفاء والوزراء والسلاطین والقضاۃ والخاصۃ والعامۃ یصدعھم بذلک علی رؤس الاشھاد ورؤس المنابر وفی المحافل وینکر علی من یولی الظلمۃ ولاتاخذہ فی اللہ لومۃ لائم.

آپ خلفاء، وزراء، سلاطین، قضاۃ، خواص وعوام سب کو امر بالمعروف نہی عن المنکر فرماتے اور بڑی صفائی اور جرأت کے ساتھ ان کو بھرے مجمع میں اور بر سر منبر علی الاعلان ٹوک دیتے، جو کسی ظالم کو حاکم بناتا اس پر اعتراض کرتے، اور خدا کے معاملے میں کسی ملامت کرنے والی کی آپ کو پرواہ نہ ہوتی۔

صاحب ''قلائد الجواہر'' لکھتے ہیں کہ جب خلیفہ مقتفی لامر اللہ نے قاضی ابوالوفاء یحییٰ بن سعید بن یحییٰ بن المظفر کو قاضی بنایا جو ابن المرجم الظالم کے لقب سے مشہور تھا تو حضرت نے بر سر منبر خلیفہ کو مخاطب کر کے فرمایا:

ولّیت علی المسلمین اظلم الظالمین ماجوابک غدا عند رب العلمین ارحم الراحمین.

تم نے مسلمانوں پر ایک ایسے شخص کو حاکم بنایا جو اظلم الظالمین ہے کل کو قیامت کے دن تم اس رب العالمین کو جو ارحم الراحمین ہے کیا جواب دو گے؟

مورخ موصوف کا بیان ہے کہ خلیفہ یہ سن کر لرزہ براندام ہو گیا، اور اس پر گریہ طاری ہو گیا،

اوراس نے اسی وقت قاضی کواس عہدہ سے ہٹادیا۔

حضرت ان ’’درباری سرکاری‘‘ علماء اور مشائخ کی بھی پرزور تردید اور پردہ دری فرماتے تھے، جنہوں نے سلاطین اور ناخداترس حکام کی مصاحبت اختیار کی تھی، اوران کی ہاں میں ہاں ملانا ان کا شعار تھا، جن کی وجہ سے ان سلاطین وحکام کو زیادہ جرأت اور بے خوفی پیدا ہوگئی تھی، ایک موقع پر اسی طبقے کوخطاب کر کے فرماتے ہیں:

’’اے علم وعمل میں خیانت کرنے والو! تم کو ان سے کیا نسبت، اے اللہ اور اس کے رسول کے دشمنو! اے بندگان خدا کے ڈاکوؤ تم کھلے ظلم اور کھلے نفاق میں (مبتلا) ہو، یہ نفاق کب تک رہے گا؟ اے عالمو! اور اے زاہدو! شاہان وسلاطین کے لیے کب تک منافق بنے رہوگے کہ ان سے دنیا کا زرومال اور اس کی شہوات ولذات لیتے رہو، تم اور اکثر بادشاہ اس زمانے میں اللہ تعالی کے مال اور اس کے بندوں کے متعلق ظالم وخائن بنے ہوئے ہیں، بار الہا! منافقوں کی شوکت توڑ دے، اوران کو ذلیل فرما، یا ان کو توبہ کی توفیق دے، اور ظالموں کا قلع قمع فرما، اور زمین کو ان سے پاک کردے، یا ان کی اصلاح فرما‘‘

ایک دوسرے موقع پر اسی طبقہ کے ایک فرد کو اپنا مخاطب بناتے ہوئے فرماتے ہیں:

’’تجھے شرم نہیں آتی کہ تیری حرص نے تجھ کو ظالموں کی خدمت گاری اور حرام خوری پر آمادہ کردیا، تو کب تک حرام کھاتا اور دنیا کے ان (ظالم) بادشاہوں کا خدمت گار بنا رہے گا، جن کی خدمت میں لگا ہوا ہے، ان کی بادشاہت عنقریب مٹ جائے گی، اور تجھے حق تعالی کی خدمت میں آنا پڑے گا، جس کی ذات کو کبھی زوال نہیں۔‘‘

دین کے لیے دل سوزی اور فکرمندی

حضرت شیخ دینی اور اخلاقی انحطاط کو (جس کا سب سے بڑا مرکز خود بغداد تھا) دیکھ دیکھ کر کڑھتے تھے، اور عالم اسلام میں جو ایک عام دینی زوال رونما تھا اس کے آثار دیکھ کر ان کے سینے میں حمیت اسلامی اور غیرت دینی کا جوش اٹھتا تھا، وہ اپنے اس قلبی احساس اور درد کو بعض

اوقات چھپا نہیں سکے، اور یہ دریا ان کے خطبات اور مواعظ میں امنڈ آیا ہے۔

ایک موقع پر ارشاد فرماتے ہیں:

''جناب رسول اللہ ﷺ کے دین کی دیواریں پے درپے گر رہی ہیں، اور اس کی بنیاد بکھری جاتی ہے، اے باشندگان زمین آ ؤ اور جو گر کیا ہے، اس کو مضبوط کر دیں اور جو ڈھے گیا ہے، اس کو درست کر دیں، یہ چیز ایک سے پوری نہیں ہوتی سب ہی کو مل کر کام کرنا چاہئے اے سورج! اے چاند! اور اے دن تم سب آ ؤ''۔

ایک دوسرے موقع پر فرماتے ہیں:

''اسلام رو رہا ہے، ان فاسقوں اور ان بدعتیوں، گمراہوں، مکر کے کپڑے پہننے والو اور ایسی باتوں کا دعویٰ کرنے والوں کے (ظلم) سے جو ان میں موجود نہیں ہیں، اپنے سر کو تھامے ہوئے فریاد مچا رہا ہے، اپنے متقدمین اور نظر کے سامنے والوں پر غور کرو کہ امر و نہی بھی کرتے تھے، اور کھاتے پیتے بھی تھے، (اور دفعتاً انتقال پا کر کے ایسے ہو گئے) گویا ہوئے ہی نہیں تھے، تیرا دل کس قدر سخت ہے؟ کتا بھی شکار کرنے اور کھیتی اور مویشی کی نگہبانی اور مالک کی حفاظت کرنے میں اپنے مالک کی خیر خواہی کرتا ہے، اور اسے دیکھ کر خوشی کے بارے میں کھلاریاں کرتا ہے، حالاں کہ وہ اس کو شام کے وقت صرف ایک دو نوالے یا ذرا سی مقدار کھانا دیا کرتا ہے، اور تو ہر وقت اللہ کی قسم قسم کی نعمتیں شکم سیر ہو کر کھاتا رہتا ہے، مگر ان نعمتوں کے دینے سے جو اسے مقصود ہے، نہ تو اس کو پورا کرتا ہے، اور نہ اس کا حق ادا کرتا ہے، (بلکہ اس کے برعکس) اس کا حکم رد کرتا ہے، اور اس کی حدود و شریعت کی حفاظت نہیں کرتا۔''

بیعت و تربیت

ان پُر تاثیر اور انقلاب آفریں مواعظ سے اگرچہ اہلِ بغداد کو عظیم الشان روحانی اور اخلاقی نفع پہونچا، اور ہزار ہا انسانوں کی زندگی میں اس سے تبدیلی پیدا ہو گئی، لیکن زندگی کے گہرے تغیرات، ہمہ گیر اصلاح اور مستقل تربیت کے لیے صاحب دعوت سے مستقل اور گہرے تعلق اور

مسلسل اصلاح وتربیت کی ضرورت تھی، مجالس دعوت وارشاد مدارس کی طرح منضبط اور مستقل تربیت گاہیں نہیں ہوتیں جہاں طالبین کی تسلسل اور انضباط کے ساتھ تعلیم وتربیت اور نگرانی کی جائے، ان مجالس کے شرکاء وسامعین آزاد ہوتے ہیں، کہ ایک مرتبہ وعظ سن کر چلے جائیں پھر کبھی نہ آئیں، یا ہمیشہ آتے رہیں، لیکن اپنی حالت پر قائم رہیں، اور ان کی زندگی میں بدستور بڑے بڑے خلا اور دینی اور اخلاقی شگاف باقی رہیں۔

اسلامی آبادی کا پھیلاؤ اور زندگی کی ذمہ داریاں اور معاشی تفکرات اتنے بڑھ گئے تھے، کہ مدارس کے ذریعہ سے (جن کو بہت سی رسوم وقیود کا پابند ہونا پڑتا ہے) عمومی اصلاح وتربیت کا کام نہیں لیا جاسکتا تھا، اور کسی بڑے پیانے پر کسی دینی وروحانی انقلاب کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی، پھر اس کی کیا صورت تھی کہ مسلمانوں کی بڑی تعداد اپنے ایمان کی تجدید کرے، دینی ذمہ داریوں اور پابندیوں کو شعور اور احساس کی ذمہ داری کے ساتھ دوبارہ قبول کرے، اس میں پھر ایمانی کیفیات اور دینی جذبات پیدا ہوں، اس کے افسردہ ومردہ دل میں پھر محبت کی گرمی پیدا ہو، اور اس کے مضمحل قویٰ میں پھر حرکت ونشاط پیدا ہو، اس کو کسی مخلص اور خداشناس پر اعتماد ہو، اور اس سے وہ اپنے مرض روحانی ونفسانی میں علاج اور دین میں صحیح روشنی اور رہنمائی حاصل کرے، ناظرین کو اس کا اندازہ ہو چکا ہے کہ خلافت جس کا یہ اصلی فرض تھا، (اس لیے کہ جس نبی کی نیابت اور نسبت پر یہ خلافت قائم تھی، بقول سیدنا عمر بن عبدالعزیز وہ ہدایت کے لیے مبعوث ہوا تھا، جبایت (تحصیل وصول) کے لیے نہیں) نہ صرف اس فریضہ سے غافل اور کنارہ کش ہو چکی تھی، بلکہ اپنے واعمال وکردار کے لحاظ سے اس کام کے لیے مضر اور اس کے راستے میں مزاحم تھی، دوسری طرف وہ اس قدر بدگمان، توہم پرست اور شکی واقع ہوئی تھی کہ کسی نئی تنظیم اور نئی دعوت کو جس میں وہ قیادت اور سیاست کی آمیزش پاتی، برداشت نہیں کرسکتی تھی، اس کو وہ فوراً کچل دیتی۔

ایسی صورت میں مسلمانوں میں نئی دینی زندگی، نیا نظم وضبط اور نئے سرے سے حرکت وعمل پیدا کرنے کے لیے اس کے علاوہ کیا شکل تھی کہ خدا کا کوئی مخلص بندہ آں حضرت ﷺ کے طریقہ پر ایمان وعمل، اور اتباع شریعت کے لیے بیعت لے، اور مسلمان کے اس ہاتھ پر اپنی سابقہ غفلت و جاہلیت کی زندگی سے توبہ اور ایمان کی تجدید کریں اور پھر وہ نائب پیغمبران کی دینی نگرانی، اور تربیت کرے، اپنی کیمیا اثر صحبت، اپنے شعلۂ محبت، اپنی استقامت اور اپنے نفسِ گرم سے پھر ایمانی حرارت، گرمیٔ محبت، خلوص وللّٰہیت، جذبۂ اتباعِ سنت اور شوق آخرت پیدا کردے، ان کو اس نئے تعلق سے محسوس ہو کہ انہوں نے ایک نئی زندگی سے توبہ کی ہے، اور ایک نئی زندگی میں قدم رکھا ہے، اور کسی اللہ کے بندے کے ہاتھ میں دے دیا ہے، وہ بھی یہ سمجھے کہ ان بیعت کرنے والوں کی اصلاح وتربیت اور ان کی دینی خدمت اللہ تعالیٰ نے میرے سپرد کی ہے، اور اس محبت واعتماد کا مجھ بر نیا حق قائم ہوگیا ہے، پھر اپنے تجربہ واجتہاد اور کتاب وسنت کے اصول وتعلیمات کے مطابق ان میں صحیح روحانیت، تقویٰ اور ان کی زندگی میں ایمان واحتساب واخلاص، اور ان کے اعمال وعبادات میں کیفیات اور روح پیدا کرنے کی کوشش کرے، یہی حقیقت ہے، اس بیعت وتربیت کی، جس سے دین کے مخلص داعیوں نے اپنے اپنے وقت میں احیاء وتجدید دین اور اصلاح مسلمین کا کام لیا ہے، اور لاکھوں بندگان خدا کو ''حقیقت ایمان اور درجۂ احسان'' تک پہونچا دیا ہے، اس سلسلۂ زریں کے سرِ حلقہ حضرت شیخ محی الدین عبدالقادر جیلانیؒ ہیں، جن کا نام اور کام اس ''طبِ نبوی'' کی تاریخ میں سب سے زیادہ روشن اور نمایاں ہے، الفاظ واصطلاحات اور علمی بحثوں سے الگ ہوکر اگر واقعات وحقائق پر بنیاد رکھی جائے تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس دورِ انتشار میں (جو ابھی تک قائم ہے) اصلاح وتربیت کا اس سے زیادہ سہل اور عمومی اور اس سے زیادہ موثر اور کارگر ذریعہ نہیں ہوسکتا تھا۔

حضرت شیخ سے پہلے دین کے داعیوں اور مخلص خادموں نے اس راستہ سے کام کیا ہے اور

ان کی تاریخ محفوظ ہے، لیکن حضرت شیخ نے اپنی محبوب اور دلآویز شخصیت، خدا داد روحانی کمالات، فطری علو استعداد اور ملکۂ اجتہاد سے اس طریقہ کو نئی زندگی بخشی، وہ نہ صرف اس سلسلہ کے ایک نامور امام اور ایک مشہور سلسلہ (قادریہ) کے بانی ہیں، بلکہ اس فن کی نئی تدوین وترتیب کا سہرا آپ ہی کے سر ہے، آپ سے پہلے وہ اتنا مدون اور مرتب اور مکمل ومنضبط نہ تھا، اور نہ اس میں اتنی عمومیت اور وسعت ہوئی تھی، جتنی آپ کی مقبولیت اور عظمت کی وجہ سے پیدا ہوگئی، آپ کی زندگی میں لاکھوں انسان اس طریقہ سے فائدہ اٹھا کر ایمان کی حلاوت سے آشنا، اور اسلامی زندگی اور اخلاق سے آراستہ ہوئے، اور آپ کے بعد آپ کے مخلص خلفاء اور باعظمت اہل سلسلہ نے تمام ممالک اسلامیہ میں دعوت الی اللہ اور تجدید ایمان کا یہ سلسلہ جاری رکھا، جن سے فائدہ اٹھانے والوں کی تعداد اللہ تعالی کے سوا کوئی نہیں بیان کرسکتا۔ یمن، حضرموت، اور ہندوستان میں، پھر حضرمی مشائخ وتجار کے ذریعہ جاوہ اور سماٹرا میں اور دوسری طرف افریقہ کے براعظم میں لاکھوں آدمیوں کی تکمیل ایمان اور لاکھوں غیرمسلموں کے قبول اسلام کا ذریعہ بنا۔ رضی الله عنه وارضاه وجزاه عن الاسلام خير الجزاء.

☆☆☆

مذہب اور قومیت کے اثرات

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ

معتقدات جماعت پر مذہب وقومیت کے اثرات

یہ بات بتائی جا چکی ہے کہ جماعت کے اقدار ومعتقدات پر مذہب کا اثر بہت گہرا اور دور رس ہوتا ہے۔ دیگر موثرات وعوامل میں سے مذہب کی طرح اثر کرنے والی ایک دوسری حالت قومیت کے رشتہ میں بھی ہے۔

مذہب اور قومیت کے اثرات عام طور پر سماج کے معتقدات واقدار کے وسیع دائروں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان دونوں کا تعلق انسانوں کے جذبات اور دل سے گہرا ہے اور سماج کی زندگی کو ایک مخصوص رنگ دینے میں ہر ایک کا بڑا حصہ ہوتا ہے۔

مذہب

جہاں تک مذہب کا تعلق ہے وہ سماج کا رشتہ خالق ومعبود سے جوڑتا ہے اور اس کے معتقدات وعادات کو اس کی مرضی کے تحت لانا چاہتا ہے اور اس سلسلہ میں انسانوں کے دل میں چھپے ہوئے مذہبی جذبہ کو متحرک کرتا ہے اور فعال بناتا ہے۔

ان دیکھی طاقت کی عظمت کا احساس

انسان کی فطرت اور اندرونی شعور ایک ان دیکھی طاقت کی عظمت کا دبا ہوا دھیان رکھتا ہے اور جب کوئی ایسا خیال یا حال سامنے آتا ہے جس میں اس غیر مرئی طاقت کا ہاتھ محسوس ہوسکتا ہے تو فوراً اس کے جذبات اور احساسات اس کے تصور سے متاثر ہوتے ہیں اور وہ تاثر

عمل پر اور رجحانات پر ظاہر ہونے لگتا ہے۔

یہ کیفیت نہایت غیر تعلیم یافتہ اور جاہل معاشروں سے لے کر ترقی یافتہ اور متمدن معاشروں تک سب میں پائی جاتی ہے۔ فرق صرف یہ ہوتا ہے کہ غیر تعلیم یافتہ معاشرہ میں اس کا کھلا اظہار ہوتا ہے اور ترقی یافتہ اور متمدن معاشروں میں اگر کھلا اظہار نہ ہو تو بند اظہار ہوتا ہے۔ حتی کہ وہ معاشرے جن میں مذہب کے اثر کو مختلف طریقوں سے ختم کرنے کی مسلسل کوشش کی گئی وہاں بھی مذہب کے اثرات جڑوں کی شکل میں باقی رہے اور جیسے ہی ان کو مدد ملی ان کی زندگی ظاہر ہونے لگی۔ اس کے لیے روسی نظام میں مذہب کے اثرات کا بحالہ باقی رہنا بہت بڑی دلیل ہے۔ جہاں ہر طرح مذہب کے عمل دخل ختم کرنے کے وسائل اختیار کئے گئے۔ بالآخر مذہب کو اپنے اثرات کسی نہ کسی حد تک ظاہر کرنے کی اجازت وہاں بھی دینی پڑی۔

مذہب ایک عظیم طاقت

مذہب ایک عظیم طاقت ہے جو ایک طرف معتقدات وخیالات کو تشکیل دینے میں بڑا حصہ لیتی ہے اور دوسری طرف جماعت اور فرد کے اندر زندگی، ہمت اور حوصلہ بھی پیدا کرتی ہے اور بعض وقت اس سے ایسے عظیم کام انجام دلوادیتی ہے جو دوسرے طریقوں سے انجام نہیں پا سکتے۔ مذہب کی تعلیمات میں ایسے عناصر ہوتے ہیں، جو انسان کی جذباتی اور معنوی طاقت کو مضبوط سہارا دیتے ہیں اور حوصلہ کو زندگی بخشتے ہیں اور بعض بعض وقت اتنی بڑی قربانیوں پر آمادہ کرتے ہیں جن کا تصور آسان نہیں ہوتا۔

انسانی تاریخ میں مذہب کی مضبوط اثر اندازی کی بے شمار مثالیں گزری ہیں بلکہ صحیح یہ ہے کہ یورپ کے جدید ملحدانہ اور باغیانہ فلسفیوں کی کامیابی سے پہلے مذہب کے سہارے کے بغیر دنیا میں کہیں نہ سیاست کامیاب ہوتی تھی اور نہ حکومت اور نہ کوئی اجتماعی کام انجام پاتا تھا اور نہ

کوئی تربیتی یا اصلاحی جد وجہد۔حتی کہ حکمرانوں کو اپنے اقتدار کی بقا کے لیے مذہب کی تائید وتعاون کا سہارا لینا پڑتا تھا۔

مذہب وسائنس کی کش مکش

یورپ میں علمی وصنعتی انقلاب کے وقت مذہب اور سائنس کی کش مکش شروع ہوئی اور عیسائی مذہب کے علمبرداروں کی غلطیوں اور ناسمجھیوں کے نتیجہ میں دین ودنیا کی تفریق کا نظریہ وجود میں آیا اور اس کو نافذ کیا گیا۔لیکن مذہب کی طاقت کو توڑنے یا بے اثر کرنے کے لیے اس کی جیسی نہ سہی اس کے قریب کی طاقت سے کام لینے کی ضرورت تھی وہ کام اس تفریق کے داعیوں نے قومیت کے نظریہ سے لیا۔

یہ قومیت جو دراصل مذہب کے تابع رہ کر کام کرتی تھی اس وقت سے مذہب کی حریف بنی اور اس نے مذہب کے اثرات کو بہت نقصان پہونچایا۔لیکن اسے ختم کرنے میں اس کو پھر بھی کامیابی نہیں ہوئی اور مذہب اور مذہب بیزار قومیت کے دریمان یہ کش مکش اب بھی دنیا کے بڑے حصے میں چل رہی ہے۔

قومی جذبات کا عمل اور عصبیت

مذہب اگر اپنے ماننے والوں کو خالق ومعبود سے جوڑنا چاہتا ہے اور انسانوں کے دلوں کے ان جذبات کو متحرک کرتا ہے جو ان دیکھی طاقت کی عظمت کا احساس وخوف رکھتے ہیں،تو قومیت اپنے افراد کو ان کے مشترکہ نسلی،ثقافتی ووطنی جذبات کو متحرک کرتی ہے۔یہ جذبات بھی فطرت انسانی کے اندر پائے جاتے ہیں اور متحرک ہونے پر اثر کرتے ہیں۔دراصل انسان کو اپنے سے تعلق رکھنے والے ہر فرد اور ہر چیز سے ایک اندرونی تعلق ہوتا ہے۔وہی تعلق ترقی کر کے عصبیت اختیار کر لیتا ہے یہ عصبیت انسان کے مزاج کا جز ہے۔مذہب کا راستہ مل جائے تو ادھر چلتی ہے قومیت کا راستہ مل جائے تو ادھر چلتی ہے۔

مذہب میں بے غرضی وایثار

مذہب چوں کہ انسان کا تعلق ایک بالا طاقت سے جوڑتا ہے اس لیے اس کی کامیابی واثر کی صورت میں انسان اپنی ذاتی خواہش، ذاتی مصلحت، ذاتی مفادات کو اس طاقت کی مرضی کے لیے قربان کر دیتا ہے اور عظیم اقدار کے لیے بے نفسی، بے غرض قربانی، بے لوث خدمت اور ہمدردی کا ثبوت دیتا ہے اور اس طرح کسی بھی معاشرہ کی ترقی اور بقا کے لیے مدد وترقی کا باعث بنتا ہے۔ یہ اقدار کسی بھی معاشرے میں اگر عام ہو جائیں تو وہ معاشرہ ایک خوش بخت اور امن وعافیت اور کامیابی کا دلکش معاشرہ بن جاتا ہے۔

قومیت میں خودغرضی وتفرقہ وانانیت

اس کے برعکس قومیت کا مزاج خودغرضی پر مبنی ہے یعنی اپنی چیز، اپنا نفع، اپنی مصلحت اس کی بنیاد ہوتی ہے جو کہ دوسرے کی چیز، دوسرے کے نفع اور دوسرے کی مصلحت سے کہیں بھی ٹکراسکتی ہے۔ قومیت میں آفاقیت اور دوسرے کے لیے بے غرضی، اعتماد کرنے کے جذبہ کو مدد نہیں ملتی، بلکہ انسانیت بڑے اور چھوٹے گروہوں میں بٹنے لگتی ہے۔ پھر بڑے گروہ مزید چھوٹے گروہوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں، اس تفرقہ وتقسیم کو اگر مذہب کی طاقت سے نہ روکا جاسکتا ہو تو پھر جبر وطاقت کے علاوہ کوئی اور چیز اس کو نہیں روک سکتی۔

آج جہاں بھی خالص قومی بنیاد پر نظام قائم کئے گئے ہیں وہاں اگر اس کے نظریہ کو پوری آزادی دے دی جائے تو ہر ایک قومیت متعدد بلکہ دسیوں قومیتوں میں تقسیم ہو سکتی ہے۔ کہیں پر یہ تقسیم لسانی بنیاد پر ہوگی اور کہیں نسلی بنیاد پر اور کہیں اقتصادی بنیاد پر اور کہیں سیاسی بنیاد پر اور کہیں کسی اور بنیاد پر کیوں کہ ان میں سے ہر ایک نظریہ قومی گروہ بندی کی اساس بننے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے اور آج دنیا کے کتنے ملک ہیں جو ان بنیادوں پر اپنی قومیت کے نظام کو چلا رہے ہیں۔ ☆☆

اسلام اور ٹریفک

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب

آج سے تقریباً پندرہ سال پہلے جب میں پہلی بار جنوبی افریقہ گیا تو کسی جدید ترقی یافتہ ملک کی طرف وہ میرا پہلا سفر تھا، اب تو جنوبی افریقہ پرامن طور پر آزاد ہو چکا ہے، اور وہاں نسلی امتیاز کی پالیسی ایک قصۂ پارینہ بن چکی ہے، لیکن ان دنوں وہاں سفید فام ڈچ حکمرانوں کا راج تھا، اور نسلی امتیاز کے قوانین پوری آب وتاب پر تھے، چناں چہ بڑے شہروں میں مستقل رہائش کا حق صرف گوروں کو حاصل تھا، دوسری نسلوں کے لوگوں کے لیے الگ الگ آبادیاں قائم تھی، جو ان بڑے شہروں سے کافی فاصلے پر واقع تھیں، جوہانسبرگ سے تقریباً تیس میل دور ایک ایسی ہی خوب صورت آبادی ''آزادویل'' کے نام سے بسائی گئی تھی، جو تمام تر ہندوستانی نسل کے باشندوں کے لیے مخصوص تھی، ہمارے میزبان چوں کہ اسی آبادی میں رہتے تھے، اس لیے ہمارا قیام بھی وہیں ہوا، یہ بڑی پرفضا بستی تھی، جو زیادہ تر رہائشی مکانات پر مشتمل تھی۔ تھوڑی آبادی کے لیے اگر ایک وسیع رقبے پر منصوبہ بندی کے ساتھ مکانات بنائے جائیں تو ظاہر ہے کہ بستی میں کشادگی کا احساس ہوگا، یہی صورت یہاں بھی تھی کہ یہ بستی بہت خوب صورت لگتی تھی، کھلی کھلی، پرسکون اور حد درجہ صاف ستھری۔ یہاں کے مکینوں میں سے تقریباً ہر شخص کے پاس اپنی اپنی کار تھی، لیکن سڑکوں پر ہجوم کا سوال ہی نہیں تھا، پیدل چلنے والے بہت کم تھے، سڑک پر اکّا دکّا چلنے والے نظر آجاتے، اور وہ بھی زیادہ تر فٹ پاتھ پر، ورنہ سڑکیں زیادہ تر سنسان پڑی رہتی تھیں، لیکن ان سنسان سڑکوں پر بھی ہر چھوٹے سے چھوٹے موڑ کے کنارے زمین پر ایک سیاہ

لائن کھینچی نظر آتی تھی، اور بعض مقامات پر موڑ کے بغیر بھی، میں کار میں سفر کرتے ہوئے دیکھا کہ کار چلانے والا اس لائن پر پہنچ کر چند لمحوں کے لیے رکتا، اور دائیں بائیں دیکھنے کے بعد پھر آگے بڑھتا، میرے لیے حیرت انگیز بات یہ تھی کہ سڑک دور دور تک سنسان پڑی ہے، اور کسی آنے جانے والے کا نام ونشان نہیں ہے، اس کے باوجود ڈرائیور خواہ کتنی جلدی میں ہو، یا باتوں میں کتنا مشغول ہو، اس لکیر پر پہنچ کر رکتا ضرور ہے، اور اس کی گردن خود بخود دائیں بائیں اس طرح مڑ جاتی ہے جیسے کوئی خود کار مشین کسی ریموٹ کنٹرول کے ذریعہ مڑ رہی ہو، پہلی پہلی بار میں یہ سمجھا کہ ڈرائیو کرنے والے کو اچانک کوئی شبہ ہو گیا جس کی وجہ سے اس نے گاڑی روکی، لیکن جب بار بار یہی منظر نظر آیا تو میں نے لوگوں سے اس کی وجہ پوچھی، انہوں نے بتایا کہ ہمارے ملک میں یہ ٹریفک کا قاعدہ ہے کہ ہر موڑ پر یا جہاں زمین پر یہ لائن کھینچی ہوئی ہو، گاڑی کو روک کر دائیں بائیں دیکھنا ہر ڈرائیور کے ذمے لازم ہے، اب ہمیں اس قاعدے پر عمل کرنے کی ایسی عادت پڑ گئی ہے کہ کوئی موڑ دیکھ کر یا زمین پر کھنچی ہوئی یہ لکیر دیکھ کر پاؤں بے ساختہ بریک پر پہنچ جاتے ہیں اور گاڑی رکتے ہی گردن دائیں بائیں مڑ جاتی ہے، اس کے بعد جتنے دن وہاں میرا قیام رہا، میں روزانہ بار بار یہ منظر دیکھتا رہا، کوئی ایک شخص بھی مجھے ایسا نہیں ملا جس نے اس قاعدے کی خلاف ورزی کی ہو، مجھے اپنی قیام گاہ سے مین روڈ تک روزانہ کئی کئی بار جانا پڑتا، ہر بار میں یہ دیکھتا کہ کار ڈرائیو کرنے والا مین روڈ تک پہنچنے سے پہلے کئی مرتبہ ان سنسان سڑکوں پر رکتا تھا، حالاں کہ مجھے اس پورے عرصے میں ٹریفک پولیس کا کوئی سپاہی ان سڑکوں پر نظر نہیں آیا جو لوگوں سے اس قاعدے کی پابندی کرا رہا ہو، نہ ہمارے ملک کی اس طرح اسپیڈ بریک نظر آئے جنہیں کار بریکر کہنا زیادہ مناسب ہے۔

یہ نظارہ پہلی بار جنوبی افریقہ میں دیکھا تھا، اور اس لیے اچنبھا معلوم ہوا تھا کہ آنکھیں پاکستان کی آزادی اور بے مہار ٹریفک دیکھنے کی عادی تھی، بعد میں یہی منظر مشرق ومغرب کے بہت سے ترقی یافتہ ملکوں میں بھی دیکھا، یہاں تک کہ اب نگاہیں اس کی بھی عادی ہوگئیں، لیکن جب اپنے ملک میں ٹریفک کا حال دیکھوتو وہ نہ صرف وہیں کا وہیں ہے، بلکہ ایسا لگتا ہے کہ الٹی سمت میں سفر کررہا ہے، تفصیل بیان کرنے کی ضرورت اس لیے نہیں وہ ہر شخص کے سامنے ہے۔

اس صورتِ حال کا سبب سرکاری انتظام کا ڈھیلا پن اور تعلیم وتربیت کا فقدان تو ہے ہی، لیکن ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ ہم نے زندگی کے ان روزمرہ کے مسائل کو دین سے باہر کی چیز سمجھ رکھا ہے، اور یہ بات ذہن میں بٹھا رکھی ہے کہ دین اور اسلام کا تعلق تو صرف مسجد اور مدرسے سے ہے، دنیوی کاروبار اور اس سلسلے کے تمام امور دین کی گرفت سے (معاذ اللہ) باہر ہیں، لہذا ٹریفک کے مسائل کا دین سے کیا واسطہ؟ اس غلط سوچ کا نتیجہ یہ ہے کہ ٹریفک کے قواعد کی خلاف ورزی کرتے ہوئے کسی کو یہ خیال نہیں آتا کہ وہ کسی گناہ کا ارتکاب کررہا ہے، بلکہ اب تو قاعدوں کو توڑنا ایک بہادری کی علامت بن گئی ہے، جو شخص جتنے قاعدے توڑے اتنا ہی وہ اپنے آپ کو بہادر اور جیالا سمجھتا ہے، اور اسی غلط سوچ کا نتیجہ یہ بھی ہے کہ اچھے بھلے دین دار لوگ جو نماز روزے کے پابند ہیں، اور مجموعی اعتبار سے حلال وحرام اور جائز وناجائز کی فکر بھی رکھتے ہیں، ٹریفک کے قواعد کی دھڑلے سے خلاف ورزی کرتے ہیں، اور نہ ان کے ضمیر پر کوئی بوجھ ہوتا ہے، نہ اس طرز عمل کو غلط یا گناہ سمجھتے ہیں، چناں چہ غلط جگہ پر گاڑی کھڑی کردینا، مقررہ رفتار سے زیادہ تیز گاڑی چلانا، غلط سمت میں سفر کرنا، رکنے کے سرخ اشارے کو توڑ دینا جہاں اوورٹیکنگ ممنوع ہے وہاں گاڑیوں کی باقاعدہ ریس لگانا، روزمرہ کا کھیل بن کر رہ گیا ہے،

حالاں کہ یہ سارے کام صرف بے قاعدگی کے زمرے میں ہی نہیں آتے، بلکہ دینی اعتبار سے گناہ بھی ہیں، اول تو اس لیے کہ ٹریفک کے تمام قواعد دراصل تمام انسانوں کی مصلحت کے تحت بنائے گئے ہیں، اور جو قوانین حکومت کی طرف سے عمومی مصلحت کے لیے بنائے جائیں، ان کی پابندی شرعی اعتبار سے بھی واجب ہے، اور ان کی خلاف ورزی ناجائز، قرآن کریم کا ارشاد ہے کہ:

اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول و اولی الامر منکم

اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اور اپنے ذمہ دار اور حاکموں کی اطاعت کرو۔

اس اطاعت سے مراد یہی ہے کہ حکام عمومی مصلحتوں کی بنیاد پر جو قاعدے مقرر کریں (بشرطیکہ وہ شریعت کے خلاف نہ ہو) ان کی پابندی کی جائے، اس پابندی کا حکم اللہ اور رسول کی اطاعت کے ساتھ دیا گیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ایسے قواعد کی پابندی شرعاً بھی ضروری ہو جاتی ہے۔

دوسرے جب کوئی شخص سڑک پر گاڑی چلانے کا لائسنس لیتا ہے تو وہ حکام سے زبانی، تحریری یا کم از کم عملی وعدہ کرتا ہے کہ وہ سڑک پر گاڑی چلاتے وقت تمام مقررہ قواعد کی پابندی کرے گا، اگر لائسنس کی درخواست دیتے وقت ہی وہ متعلقہ حکام کو یہ بتا دے کہ وہ ٹریفک کے اصولوں کی رعایت نہیں رکھ سکے گا، تو اسے کبھی لائسنس نہ دیا جائے، لہذا اسے لائسنس اسی وعدے کی بنیاد پر دیا گیا ہے، چناں چہ اس کے بعد اگر وہ ٹریفک کے قواعد کو توڑتا ہے تو اس میں وعدے کی خلاف ورزی کا بھی گناہ ہے۔

تیسرے ان قواعد کو توڑنے سے عموماً کسی نہ کسی انسان کو تکلیف ضرور پہنچتی ہے۔ بعض

اوقات تو اسی بنا پر کوئی حادثہ پیش آ جاتا ہے، اور کسی بے گناہ کی جان چلی جاتی ہے، یا اسے کوئی اور جسمانی نقصان پہنچ جاتا ہے، یا کم از کم اتنا تو ہوتا ہی ہے کہ اس سے دوسروں کو ذہنی تکلیف پہنچتی ہے، اور یہ بات میں ان صفحات میں بار بار لکھ چکا ہوں کہ کسی بھی شخص کو بلا وجہ تکلیف پہنچانا اتنا سنگین گناہ ہے کہ اس کی معافی صرف توبہ سے نہیں ہوتی، جب تک وہ شخص معاف نہ کرے۔

اسلامی فقہ کی ہر کتاب میں یہ اصول لکھا ہوا ہے کہ عام راستوں پر چلنا اور کوئی سواری چلانا اس شرط کے ساتھ جائز ہے کہ چلنے والا دوسروں کی ''سلامتی'' کی ضمانت دے، یعنی ایسے ہر کام سے اجتناب کرے جو کسی دوسرے شخص کے لیے تکلیف یا خطرے کا باعث بن سکتا ہو، اس احتیاط کے بغیر اس سڑک کا استعمال ہی جائز نہیں، جو تمام باشندوں کی مشترکہ ملکیت ہے، اور اگر اس بے احتیاطی کے نتیجے میں کسی شخص کو کوئی جانی یا مالی نقصان پہنچ جائے تو اس کا سارا تاوان شرعی اعتبار سے اس شخص کے ذمے عائد ہوتا ہے، جس نے بے احتیاطی کے ساتھ سڑک کو استعمال کیا۔

اب غور فرمائیے کہ اگر ایک شخص سگنل توڑ کر گاڑی آگے لے گیا، یا اس نے کسی ایسی جگہ سامنے والی گاڑی کو اوورٹیک کیا جہاں ایسا کرنا ممنوع تھا، تو بظاہر تو یہ معمولی سی بے قاعدگی ہے، لیکن درحقیقت اس معمولی سی حرکت میں چار بڑے گناہ جمع ہیں، ایک قانون شکنی، اور حاکم کے جائز حکم کی نافرمانی کا، دوسرے وعدہ خلافی کا، تیسرے کسی کو تکلیف پہنچانے کا، چوتھا سڑک کے ناجائز استعمال کا یہ گناہ ہم دن رات کسی تکلف کے بغیر اپنے دامنوں میں سمیٹ رہے ہیں، اور خیال بھی نہیں آتا کہ ہم سے کوئی گناہ سرزد ہو رہا ہے۔

پھر بعض اوقات کسی ایک شخص کی بے قاعدگی سینکڑوں انسانوں کا راستہ ہی بالکل بند کر دیتی

ہے، مثلاً سڑک کے ایک حصے میں اگر کسی وجہ سے ٹریفک رک گیا تو بعض جلد باز لوگ تھوڑے انتظار کی زحمت گوارا کرنے کے بجائے سڑک کے اس حصے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں جو آنے والے ٹریفک کے لیے مخصوص ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آنے والی گاڑیوں کا راستہ رک جاتا ہے، اور گھنٹوں تک کے لیے ٹریفک اس طرح جام ہو جاتا ہے کہ نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن۔ اس قسم کی بے قاعدگی درحقیقت ''فساد فی الارض'' کی تعریف میں آتی ہے، اور سینکڑوں انسانوں کو کرب وعذاب میں مبتلا کرنے کا گناہ اس شخص پر ہے جس نے غلط سمت میں گاڑی لے جا کر اس صورتِ حال سے لوگوں کو دوچار کیا۔

ہمارے دین نے ہمیں یہ ساری باتیں بتائی ہیں، ان کے بارے میں تفصیلی ہدایات دی ہیں، اور وہ تعلیمات عطا کی ہیں جو ہر دور میں سدا بہار ہیں، لیکن ہم نے ان کو سمجھنے سیکھنے اور ان پر عمل کرنے کے بجائے دین کو صرف مسجد اور مدرسے کی چار دیواری تک محدود کر ڈالا، دوسری قوموں نے ان اصولوں پر عمل کر کے کم از کم اپنا ظاہری نظم وضبط درست کر لیا، لیکن ہم انہیں چھوڑ کر اپنی آخرت بھی خراب کر رہے ہیں، اور اپنی دنیا کو بھی مشکلات اور بے چینیوں کی آماجگاہ بنا رکھا ہے، اور اپنی بدعملی سے اسلام کے رخِ زیبا کو بھی مسخ کر رکھا ہے۔ لیکن ان مسائل کا حل صرف ان پر دور دور سے تبصرہ کر لینا نہیں ہے، بات اسی وقت بنے گی جب ہر شخص اپنی اپنی جگہ اپنے ضمیر کو بیدار کرے، اور دوسروں کے طرزِ عمل سے بے نیاز ہو کر کم از کم خود گناہوں سے بچنے اور ان زریں اسلامی اصولوں پر عمل کرنے کا آغاز کر دے، تبدیلی ہمیشہ افراد کے ذاتی عمل سے وجود میں آتی ہے، اور پھر وہی رفتہ رفتہ قومی مزاج کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔

☆☆☆

فقہ و فتاویٰ

حضرت مولانا مفتی احمد صاحب خان پوری دامت برکاتہم

عقد میں طے شدہ چیز دینا ضروری ہے:

سوال: بعض آدمیوں نے زید نامی شخص کو ایک رقم دے کر کہا کہ اس رقم سے کپڑے لاکر غریب طالب علموں کو تقسیم کردو، زید نے اپنے ایک متعلق: بکر نامی شخص سے بات کی، جو کپڑے کا تاجر ہے، بکر نے کپڑے کے نمونے کے طور پر ایک ٹکڑا لاکر زید کو بتاتے ہوئے کہا کہ اس قسم کا کپڑا ۲۲/روپے کے حساب سے ملے گا، اور ۲۰/میٹر کا تھان ہے، مولانا خالد صاحب کہتے ہیں کہ طالب علموں کے لیے ہے کہ مجھے بالکل نفع نہیں چاہئے، میں مِل میں سے جس قیمت سے تھان لاتا ہوں اسی قیمت سے دوں گا، بلکہ اس میں سے بھی کچھ کم کردوں گا۔ زید نے بکر کی بات سن کر کہا کہ اگر آپ کے متعلق: مولانا خالد صاحب ۲۲/روپے کی قیمت کا ۲۰/روپے میٹر کا تھان دیتے ہیں تو مجھے ۲۰/تھان کی ضرورت ہے۔ اس گفتگو کے بعد دوسری مرتبہ جب بکر بھائی کی ملاقات زید سے ہوئی تو انہوں نے کہا: مولانا خالد صاحب کہتے ہیں کہ مِل والا ۲۲/روپے کے حساب سے اسی وقت کپڑے دے گا جب قیمت نقد دی جائے، اسی کے ساتھ بکر نے زید سے کہا کہ مولانا خالد صاحب کہتے ہیں کہ اگر اتنا مال زید لے گا تو آپ (بکر) کو ایک جوڑے کی قیمت مل والے سے دلواؤں گا، زید نے کہا: اس میں مجھے کوئی حرج نہیں، مجھے تو گفتگو کے مطابق مال ملنا چاہئے۔ اس کے بعد زید نے ۲۰/تھان کے نقد پیسے بکر کو دے دیے۔ کچھ دنوں کے بعد زید کی عدم موجودگی میں بکر بھائی نے کپڑے دیکھ کر کہا کہ عقد کے مطابق نہیں ہے، یہ تو ۲، ۵، ۶، ۱۲، ۱۵/میٹر کے، اور جس قسم کا مال بتلایا تھا وہ بھی نہیں ہے، حالاں کہ زید نے تو بکر کے ساتھ ۲۰/میٹر کے تھان کی بات کی تھی، اس طرح زید نے بکر سے تھان کے سلسلے میں ہونے والی گفتگو

کے مطابق دریافت کیا کہ معاملہ تو تھان کے سلسلے میں ہوا تھا، یہ اس نے کیسا مال دے دیا ہے؟ اس کے جواب میں بکر نے کہا: یہ ٹھیک ہے، البتہ اس سے بعض مال کافی اچھا ہے، تاہم زید نے مال عقد کے مطابق نہ ہونے کی وجہ سے واپس کردی۔ تو زید کا یہ معاملہ کرنا شرعاً کیا حکم رکھتا ہے؟ اور بکر یا زید مال واپس لینے سے انکار کرسکتا ہے؟ اس سلسلے میں شرعی حکم کیا ہے؟ جب کہ مولانا خالد صاحب نے اپنی دکان پر بورڈ بھی لگایا ہے کہ ''بیچا ہوا مال واپس لیا جائے گا'' جب کہ زید نے مال لوٹایا تو خالد نے کہلوایا کہ زید سے کہہ دینا کہ میرے ساتھ تو یہ معاملہ کیا: کسی اور کے ساتھ ایسا نہ کر۔ تو کیا مولوی خالد کا یہ کہنا مناسب ہے؟

نیز عقد کے بموجب نقد پیسے دیے تھے، زید نے بکر کی معرفت ان پیسوں کا مطالبہ کیا تو خالد نے کہا کہ میں نے تاجر کو دے دیے ہیں، اب میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔ تین مہینے کے بعد دوں گا۔ تو کیا خالد کا یہ جواب درست ہے؟ اس سلسلے میں شریعت کا کیا حکم ہے؟

نوٹ: مولوی خالد نے مِل میں سے کپڑے لانے کی بات کرکے اپنی دکان سے مال دے دیا، جو بکر نے قبول کیا، تو کیا یہ دھوکہ نہیں ہے؟ اگر خالد نے مال خریدنے پر ایک جوڑا بکر کو دیا تھا تو اس کے پیسے مولوی خالد واپس لے سکتے ہیں؟ اور اس طرح کپڑے دینا رشوت شمار ہوگا یا نہیں؟ اسی طرح طالب علموں کے کپڑوں کی سلائی کے لیے بھی کچھ پیسے مولوی خالد نے بکر کو دیے تھے، وہ واپس لیے جاسکتے ہیں؟ اس سلسے میں شرعی حکم کیا ہے؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

عقد جو چیز مبیع کے طور پر طے کی جائے اس کا دینا ضروری ہے، اگر اس کے علاوہ کوئی چیز دے تو خریدار اس کو واپس لوٹا سکتا ہے۔ صورتِ مسئولہ میں مبیع کے طور پر جو کپڑا طے کیا گیا تھا، ویسا کپڑا بائع نے مشتری کے حوالے نہیں کیا، اسی وجہ سے زید نے واپس لوٹا دیا، یہ ٹھیک ہے، مولوی خالد کو اس پر اعتراض کا کوئی حق نہیں۔ اور یہ عقد فسخ ہوجانے کی وجہ سے جو قیمت مولوی

خالد نے وصول کی تھی، اس کا لوٹانا ان پر ضروری ہے، لہذا ان کا اس رقم کو استعمال کرنا غلط ہے، اور جلد از جلد رقم لوٹانا ان کی ذمہ داری ہے، تین مہینے کا وعدہ درست نہیں۔

مولوی خالد نے کپڑے کا ایک جوڑا جو بکر کو دیا ہے، وہ بہ رضا ورغبت ہو تو اس کی قیمت نہیں لے سکتے، اور اگر دلالی کے طور پر دیا ہو تو واپس لے سکتا ہے۔

سلائی کی رقم بکر کے پاس جوں کی توں موجود ہو تو واپس لے سکتا ہے، اور اگر وہ رقم بکر نے سلائی میں استعمال کر لی ہو تو اس کا مطالبہ نہیں کر سکتا۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم۔

اوکٹروئی سے بچنے کی گنجائش ہے:

سوال: ہم دکان میں تجارت کے لیے مال باہر سے منگواتے ہیں، شہر میں داخلے کے وقت بلدیہ کی طرف سے زکوٰۃ ناکے ہوتے ہیں، وہاں مال کی اوکٹروئی بھرواتے ہیں۔ یہ اسلام میں جائز ہے؟ اور اوکٹروئی بھروانے کے لیے مال کی خریداری کی رسید بتانی پڑتی ہے۔ اب اصل بل نہ بتائیں اور کم قیمت کا بل بتا دیں تو جائز ہے؟ اس سے کمائی حرام ہوگی؟

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

اسلام میں اوکٹروئی کا ثبوت نہیں، ایسے ٹیکس سے بچنے کے لیے ایسی تدبیر اختیار کرنا جس میں دھوکہ بازی نہ ہو، اس کی گنجائش ہے، اور اس سے کمائی حرام نہ ہوگی۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم۔

فلیٹ کے وجود سے پہلے بیع در بیع جائز نہیں:

سوال: ایک پروجیکٹ ہے، ۳۲۱/روپے اسکوائر فٹ کے حساب سے سودا کیا گیا، کل پروجیکٹ ۳۰/ہزار اسکوائر فٹ کا ہوگا، پروجیکٹ بنانیوالا تعمیری کام کے ساتھ ۲/سال میں مکمل کر کے دے گا۔ اب اگر خریدار تعمیری کام جاری ہونے کے دوران دوسرے گاہکوں کو قسط وار رقم

کے عوض فلیٹ بیچنے لگے تو شرعاً جائز ہے یا نہیں؟ آج کل شہروں میں گورنمنٹ کے قاعدے کے مطابق اتنے بڑے پروجیکٹ کی بڑی رقم سرکار کے سامنے ظاہر نہیں کر سکتے، اگر ظاہر کر دی جائے تو انکم ٹیکس اس قدر برسے کہ وہ شخص ایسے پروجیکٹ میں پڑے ہی نہیں، اس لیے پلان پر سودا کر کے بیع در بیع کی جاتی ہے۔ تو جس پروجیکٹ کا تعمیری کام مکمل نہیں ہوا یا جاری ہے، اس کا مذکورہ طریقے پر بیچنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟ اگر جائز نہیں تو اس میں کون سی تبدیلی سے جائز ہو جائے گا؟

نوٹ: پہلے سے سودا کرنے والے شخص کو بھی قسط وار رقم ادا کی جاتی ہے، اس طرح پلان رکھا گیا ہے۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

فرمائش کے مطابق چیز بنانے والا اور پہلے سے اس کا سودا کر لینے کو شریعت کی اصطلاح میں ''استصناع'' کہا جاتا ہے۔ لوگوں میں جو چیز آرڈر کے مطابق بنانے کا رواج ہو، تو ان کے بنانے کا سودا مکان میں کرنا جائز ہے، البتہ سودا کرتے وقت پوری وضاحت اور تفصیل اس طرح بیان کر دینی چاہئے کہ کوئی چیز مبہم رہ کر آگے لڑائی جھگڑے کا خطرہ نہ رہے۔ اب اگر اس آرڈر میں طے شدہ تفصیل کے مطابق وہ چیز تیار نہ ہوئی تو آرڈر کرنے والے کو سودا فسخ کرنے کا حق ہے۔

ایک شخص نے آرڈر کے مطابق مکان بنوایا اور بائع سے قبضہ حاصل کیا، اس کے بعد اگر وہ دوسرے کو بیچنا چاہئے تو بیچ سکتا ہے، لیکن مکان تیار ہونے سے قبل آرڈر سے خریدنے والا شخص دوسرے کو نہیں بیچ سکتا، البتہ باقاعدہ سودا نہ کرے، بلکہ صرف وعدے کے طور پر یہ کہے کہ میرا مکان تیار ہو جانے کے بعد میں اسے آپ کے ہاتھ فروخت کروں گا۔ الغرض وعدے کی کارروائی کر سکتا ہے، اور جب مکان تیار ہو جائے اور اس کے قبضے میں آ جائے تب باقاعدہ بیع کرے۔ مذکورہ سوال کے مطابق پہلے بائع (بنانے والے) نے ابھی مکان تیار نہیں کیا ہے اس

سے قبل آپ دوسرے گاہک کو نہیں بیچ سکتے، ہاں! اگر آپ خود وہ پروجیکٹ تیار کرتے، تو اس دوران (شروع جواب کے مطابق) گاہک کے ساتھ سودا کر سکتے تھے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم۔

اُڑد میں بیع سلم:

سوال: ہمارے گاؤں میں بعض دین دار مسلمان اور علما بھی مندرجہ ذیل طریقے کے مطابق تجارت کرتے ہیں:

الف کو پیسوں کی ضرورت تھی وہ ب کے پاس گیا اور اس سے پیسے مانگے، ب نے کہا کہ میں سیزن پر اُڑد دوں گا، وہ دونوں تاجر کے پاس گئے، اُڑد کا بھاؤ معلوم کیا۔ سیزن میں اُڑد کا بھاؤ کم از کم ۸۰/روپے ۲۰/کلو (ا/من) کا ہوتا ہے، اس حساب کے مطابق الف کو ۱۲/ ہزار روپے کی ضرورت ہونے کی وجہ سے سیزن میں ۱۵۰/من (۳/ ہزار کلو) اُڑد دینے کا قرار ہوا، اور ب نے الف کو ۱۲/ ہزار روپے دیے۔ سیزن میں اس اُڑد کی قیمت ۱۴۰/روپے (۲۰/کلو کے) ہونے کی وجہ سے ۱۵۰/من اُڑد کے ۲۱/ ہزار روپے الف نے ب کو ادا کیے۔ اور ب نے ۱۲/ ہزار کے بہ جائے ۲۱/ ہزار روپے لے لیے۔ یہ بیع درست ہے یا نہیں؟ بائع اور مشتری دونوں کے جائز ہے یا نہیں؟ براہ کرم بتلائیں۔

الجواب: حامداً و مصلياً و مسلماً:

شریعت میں ''بیع'' کی مختلف اقسام ہیں:

ایک قسم وہ ہے جو لوگوں میں زیادہ رائج ہے، یعنی قیمت اور مبیع دونوں ہاتھ ہوں، مشتری قیمت ادا کرے اور بائع اسی وقت مبیع اس کے حوالے کر دے۔

دوسری قسم وہ ہے جس میں مبیع تو فوراً حوالے کر دی جائے، البتہ قیمت ادھار رکھی جائے۔

تیسری قسم وہ ہے جس میں قیمت فوری طور پر دے دی جائے اور مبیع ادھار رکھی جائے۔

بیع کی اس تیسری قسم کو فقہی اصطلاح میں ''بیع سلم'' کہا جاتا ہے۔لوگوں کی ضرورتوں کے پیش نظر اس تیسری قسم کو بعض شرائط کے ساتھ جائز قرار دیا ہے،اوراس کے مخصوص احکام ہیں، جو فقہ کی کتابوں میں مفصل مذکور ہیں، بیع سلم کی صحت کے لیے جو شرائط فقہ کی کتابوں میں مذکور ہیں وہ ۷/ ہیں۔

(۱) مبیع کا ذکر، مثلاً گیہوں، جوار وغیرہ۔

(۲) اس کی قسم کا ذکر، مثلاً: پیات، کوراٹ وغیرہ۔

(۳) اس کی حالت کا ذکر، مثلاً نئے/ پرانے، عمدہ/گھٹیا وغیرہ۔

(۴) مقدار کا تذکرہ مثلاً ۱۰/من، ا/کوئنٹل وغیرہ۔

(۵) مدت کا تذکرہ جو کم از کم ایک مہینہ ہونا ضروری ہے، مثلاً: ۳/مہینے پر دوں گا وغیرہ۔

(۶) ثمن طے کرنا، مثلاً: اتنے روپے وغیرہ۔

(۷) مبیع کی سپردگی کے مکان کا تذکرہ، مثلاً: ایلول میں، ہمت نگر میں وغیرہ۔

مذکورہ بالا شرائط کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ جس مجلس میں سودا ہوا، اُسی مجلس میں مشتری بائع کو نقد قیمت ادا کر دے، اگر اس مجلس میں قیمت ادا نہیں کی گئی تو یہ صفقہ شرعاً باطل شمار ہوگا۔ اور بائع مشتری کو جو چیز طے ہوئی ہے وہی چیز ادا کرے، رقم نہیں۔ اگر مذکورہ تفصیل کے مطابق سودا ہوا ہو تو شرعی نقطۂ نظر سے وہ سودا ''بیع سلم'' ہونے کی وجہ سے درست شمار ہوگا، ورنہ نہیں۔

آپ کے سوال کے مطابق آخر کار ادائیگی کے وقت الف نے ب کو اُڑد کے بہ جائے اُڑد کی رقم طور پر ۲۱/ ہزار روپے دیے، وہ شرعاً ناجائز ہے، بلکہ وہ تو ۱۲/ ہزار کے عوض ۲۱/ ہزار ادا کیے، یہ کھلم کھلا سود ہے، جو حرام ہے۔ لینے والے کے لیے اس زیادتی کا لینا ہرگز جائز نہیں، دونوں سخت گنہ گار ہوں گے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم۔ ☆☆☆

قسط دوم

محنت وریاضت

پیر ذوالفقار احمد نقشبندی

اب تجھے نیند کہاں آئے

ذکر کی لائن میں لگ کر اور بالخصوص اللہ والوں کی صحبت میں رہ کر عبادت کا ذوق اتنا بڑھ جاتا ہے کہ نیندیں اڑ جاتی ہیں۔ ہم لوگ اپنے شیخ کی صحبت میں کبھی تین دن کے لیے اور کبھی پانچ دن کے لیے حاضر ہوتے تھے۔ اس وقت خانقاہ میں اتنا فیض ہوتا تھا کہ ہمیں نیند ہی نہیں آتی تھی۔ یہ ایک دو دفعہ کی بات نہیں بلکہ ہم نے اسے بیسیوں دفعہ آزمایا، نہ دن میں نیند آتی نہ رات کو حتی کہ چوتھے پانچویں دن بدن تھک جاتا تھا مگر ذکر کی وجہ سے روح کے تو مزے ہوتے تھے۔ جب جسم تھک جاتا تو ہم عشاء کی نماز کے بعد وہ نفل پڑھ کر اللہ تعالی سے دعا مانگتے تھے کہ اے اللہ! آج مجھے سکون کی نیند عطا فرما دے، مگر نیند پھر بھی نہیں آتی تھی۔ چناں چہ ایک مرتبہ میں نے اپنے شیخ کی خدمت میں عرض کیا، حضرت! پتہ نہیں کیا معاملہ ہے کہ جب بھی آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا ہوں، دن اور رات میں کسی وقت بھی نیند نہیں آتی۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ مسکرا کر فرمانے لگے، ''ہاں مجھے میرے شیخ نے جگایا تھا اور تجھے میں نے جگایا ہے، اب تجھے نیند کہاں آئے۔'' ؎

موت کے بعد ہے بیدار دلوں کو آرام
نیند بھر کے وہی سویا جو کہ جاگا ہوگا

جو دنیا میں جاگے گا وہ قبر میں میٹھی نیند سوئے گا۔ اس لیے ہمیں اپنے اندر عبادات کرنے کا شوق پیدا کرنا چاہئے۔ علماء اور طلبہ بالخصوص اس طرف متوجہ ہوں۔ اللہ تعالی ارشاد فرماتے ہیں:

واعبد ربک حتی یاتیک الیقین (الحجر:۹۹)

اپنے رب کی عبادت کرو حتی کہ تمہیں موت آ جائے

رمی جمار کا مسئلہ اور شیطان سے نجات

جب امام ابو یوسفؒ پر نزع کی کیفیت طاری تھی، اس وقت انہوں نے ایک شاگرد سے مسئلہ پوچھا کہ رمی جمار راکباً (سوار ہوکر) افضل ہے یا ماشیاً (پیدل) افضل ہے؟ اس نے کہا، راکباً۔ فرمایا: لا۔ اس نے کہا ماشیا۔ آپ نے فرمایا: لا۔ پھر بتایا کہ راکباً کب افضل ہے اور ماشیاً کب افضل ہے۔ ابھی یہی مسئلہ بتا رہے تھے کہ اسی دوران ان کی وفات ہوگئی۔

علماء نے لکھا ہے کہ آخر انہوں نے یہ مسئلہ خود کیوں چھیڑا؟ انہوں نے اس کا جواب بھی لکھا ہے کہ موت کے آخری لمحات میں بندے کے پاس شیطان آتا ہے۔ ممکن ہے کہ اس وقت شیطان آیا ہو اور امام صاحب نے جیسے ہی شیطان کو دیکھا انہوں نے اسی وقت رمی جمار کا مسئلہ چھیڑ دیا ہو اور اسی رمی جمار کے مسئلہ کے دوران اللہ تعالیٰ نے ان کو شیطان سے نجات عطا فرما دی۔

فتویٰ پڑھتے پڑھتے اللہ کو پیارے ہو گئے !!!

دارالعلوم دیوبند کے ایک مفتی کے حالاتِ زندگی میں لکھا ہے کہ جب ان کی وفات ہوئی تو ایک فتویٰ ان کے سینے پر پڑا ہوا تھا۔ وہ اس طرح کہ انہوں نے فتوی پڑھنا شروع کیا اور پڑھتے پڑھتے وہ فتویٰ ہاتھ سے گر گیا اور اسی حالت میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔ ہمارے مشائخ نے اپنے اوقات کو اس طرح غنیمت سمجھا اور عبادات میں اپنا وقت گزارا۔

رابعہ بصریہ کا قابلِ رشک معمول

رابعہ بصریہ رحمۃ اللہ علیہا کے پاس ایک آدمی دعاؤں کے لیے حاضر ہوا۔ وہ اسوقت ظہر کی

نماز پڑھ رہی تھیں۔اس نے سوچا کہ اچھا میں بعد میں آؤں گا۔جب وہ بعد میں آیا تو وہ نفلیں پڑھ رہی تھیں، پھر آیا تو عصر کی نماز پڑھ رہی تھیں،عصر کے بعد آیا تو وہ ذکر اذکار میں مشغول تھیں، پھر آیا تو مغرب کی نماز پڑھ رہی تھیں، پھر آیا تو وہ اوابین پڑھ رہی تھیں، پھر آیا تو وہ عشاء پڑھ رہی تھیں، جب عشاء کے بعد آیا تو دیکھا کہ لمبی رکعت کی نیت باندھی ہوئی تھی،سلام ہی نہیں پھیر رہی تھیں۔وہ بیٹھا رہا، بیٹھا رہا، جب بہت تھک گیا تو کہنے لگا: اچھا سوجاتا ہوں اور فجر کے بعد مل لوں گا۔پھر فجر کے وقت آیا تو وہ فجر کی نماز پڑھ رہی تھیں۔اس کے بعد وہ اشراق پڑھ کر تھوڑی دیر کے لیے لیٹیں تو وہ آدمی پھر آیا۔کسی نے بتایا کہ انہوں نے ابھی اشراق کی نفل پڑھے ہیں اور ابھی لیٹی ہیں۔وہ کہتا ہے کہ میں بس تھوڑی دیر ہی بیٹھا تھا کہ وہ گھبرا کر اٹھیں اور آنکھیں مل کر کہنے لگیں:

اللهم انی اعوذ بك من عين لاتشبع من النوم

اے اللہ! میں ایسی آنکھوں سے تیری پناہ مانگتی ہوں جو نیند سے سیر نہیں ہوتیں۔

یہ کہہ کر اٹھ بیٹھیں اور اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مشغول ہوگئیں۔اسی طرح امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ بھی دوپہر کو قیلولہ کی نیت سے سوجاتے تھے اور باقی پورا وقت عبادت میں گزارتے تھے۔یہ بات پہلے سمجھ میں نہیں آتی تھی۔لیکن ذکر کی لائن میں لگنے کے بعد بالآخر سمجھ میں آ گئی کہ ہمارے مشائخ کو ساری ساری زندگی عبادات کی توفیق کیسے مل جاتی تھی۔اللہ تعالیٰ ان کی نیند کے وقت میں برکت دے دیتے ہیں۔چناں چہ تھوڑی دیر کی نیند ان کے جسم کو سکون دے دیتی ہے۔ان کے نزدیک سونا برائے سونا تو ہوتا نہیں۔نیند کا مقصد تو جسم کو راحت دینا ہوتا ہے کہ جسم تازہ دم ہوجائے اور پھر کام میں لگ جائے۔اسی لیے حضرت مرشدِ عالم رحمۃ اللہ علیہ اپنے آخری ایام میں فرمایا کرتے تھے،''اب میرے لیے دن اور رات کا فرق ختم ہوگیا ہے۔''

محنت کی چکی

یاد رکھیں کہ عبادات کے شوق میں مجاہدے سے نہیں گھبرانا چاہئے بلکہ خوش ہونا چاہئے کہ یہ جسم دنیا کے لیے تو ہزاروں مرتبہ تھکا، شکر ہے کہ یہ آج اللہ رب العزت کے لیے بھی تھکا ہے۔

ہمارے مشائخ نے فرمایا:

''خدا طلبی بلا طلبی''

یعنی اللہ کو طلب کرنا اور پھر دل میں طلب بھی نہ ہو۔ یہ نہیں ہوسکتا۔ بلکہ یوں سمجھو کہ ''خدا طلبی بلا طلبی'' ہے۔

یعنی اللہ کو طلب کرنا بلاؤں کو دعوت دیتا ہے۔ کیا مطلب؟ مطلب یہ ہے کہ مجاہدہ کرنا پڑتا ہے۔ بلکہ دل کی بات کہوں کہ اس دنیا میں انسان کو چکی پیسنی پڑتی ہے یا تو وہ دین کے لیے پیس لے یا پھر اللہ دنیا کے لیے پسوائیں گے۔ پیسے بغیر گزارہ نہیں ہوگا۔ پروردگار عالم نے فرمایا:

لقد خلقنا الانسان فی کبد (البلد:۴)

بے شک ہم نے انسان کو چکی پیسنے کے لیے پیدا کیا ہے۔

یہ چکی انبیائے کرام نے بھی پیسی پھر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پیسی اور پھر اولیائے امت کو یہ چکی پیسنی پڑی۔ یاد رکھنا کہ اگر کوئی دین سے ہٹے گا تو اللہ تعالی اسے دفتر میں لگادیں گے اور وہاں وہ گدھے کی طرح کام کر رہا ہوگا۔ دفتر والے بھی ماشاءاللہ اوور ٹائم میں کام کروا رہے ہوں گے اور پھر بھی خوش نہیں ہوں گے۔ سولی پر جان لٹکی ہوئی ہوگی کہ آج تو باس ناراض ہے۔ جی ہاں جسے خدا کو راضی کرنے کی فکر نہیں ہوتی اسے اللہ تعالی باس کو راضی کرنے والی فکر ڈال دیتے ہیں۔ جب چکی ہر ایک کو پیسنی ہے تو بہتر ہے کہ دین کی چکی پیسی جائے تاکہ صحیح معنوں میں انسانیت کی معراج نصیب ہوسکے۔ ؎

فرشتوں سے بہتر ہے انسان بننا
مگر اس میں لگتی ہے محنت زیادہ

حضرت شبلیؒ کے عظیم مجاہدے کی داستان

ولید بن عبدالملک کا زمانہ تھا۔اس وقت مسلمانوں کی حکومت دنیا کے بیشتر ملکوں میں پھیلی ہوئی تھی۔انہوں نے ہر ہر علاقے میں گورنر مقرر کیئے ہوئے تھے۔اس دوران آمد ورفت کا سلسلہ اتنا تیز نہیں تھا۔مختلف جگہوں سے چھ چھ مہینوں کے بعد اطلاعات آتی تھیں۔کہیں سے اطلاع ملتی کہ یہاں کے گورنر کا انتظام بہت اچھا ہے اور کہیں سے اطلاع ملتی کہ گورنر صاحب نے لوگوں کی ناک میں دم کر رکھا ہے۔ولید بہت پریشان ہوا کہ اتنا پھیلا ہوا کام ہے، میں کیا کروں۔ان کا وزیر باتدبیر تھا۔اس نے مشورہ دیا کہ بادشاہ سلامت! آپ سب گورنروں کو ایک دفعہ بلالیں اوران میں سے جو اچھا کام کرنے والے ہیں ان کو انعام دے دیں اور دوسرے بھی سمجھ دار ہیں، وہ یہ سب کچھ دیکھ کر سمجھ جائیں گے کہ ہمیں بھی اپنے آپ کو انعام کا مستحق بنانا چاہیئے۔بادشاہ کو یہ مشورہ پسند آیا اوراس نے سب گورنروں کو اطلاعات روانہ کر دیں کہ تمام گورنر فلاں تاریخ کو میرے دربار میں پہنچ جائیں۔بادشاہ کے محل کے ساتھ بہت بڑا گراؤنڈ تھا۔اس نے کہا کہ جو مہمان آئیں وہ آ کر یہاں ٹھہرنا شروع کر دیں۔اس زمانے میں بادشاہ کے مسافر خانے نہیں ہوتے تھے جہاں آ کر لوگ ٹھہر سکتے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ سفر کرنا مشکل ہوتا تھا۔

اب جس بندے نے ایک ہزار کلومیٹر سے چلنا ہے اور راستے میں دیہات ہیں، ویرانے ہیں، جنگل ہیں، دریا ہیں تو اسے ایک ہزار کلومیٹر کا سفر طے کرنے میں ایک مہینہ درکار ہوتا ہے۔ ایک مہینہ آنے میں لگے گا اور ایک مہینہ جانے میں لگے گا۔دو مہینے کا سفر بن گیا اور وہاں ٹھہرنا بھی ہوتا ہے۔اس طرح ایک ہزار کلومیٹر کا سفر طے کرنے میں تین مہینے لگ جاتے تھے۔جب وہ چلتے تو اپنی فیملی کو بھی ساتھ لے کر چلتے تھے۔جب بیوی بچے بھی ساتھ ہوتے تھے تو صاف ظاہر ہے کہ خدمت کے لیے بھی لوگ درکار ہوتے تھے۔پھران کا تین مہینے کا راشن بھی ساتھ لے کر چلتے

تھے۔آج کل تو اگر گاڑی میں ڈیزل ڈلوانا پڑے تو بچے کوئی ایسی جگہ دیکھتے ہیں جہاں سے آئس کریم بھی دستیاب ہوسکے۔ جب اتنے بندے ہوتے تھے تو ان کی سیکورٹی کے لیے بھی انتظام کیا جاتا تھا۔اس کی ترتیب یہ ہوتی تھی کہ کچھ لوگ جنگل میں اونٹوں سے بھی آگے پیدل چل رہے ہوتے تھے تاکہ اگر کوئی دشمن یا جانور راستے میں چھپا ہوا ہو تو اس کا دفاع کرسکیں۔ان کے پیچھے وہ جانور ہوتے تھے جن پر مال لدا ہوا ہوتا تھا۔ پھر اس کے بعد مہمان خصوصی اور اس کی بیگمات اور بچے ہوتے تھے۔ان کے پیچھے پھر مال والے جانور ہوتے تھے، پھر ان کے پیچھے پیدل چلنے والے لوگ ہوتے تھے۔اس طرح سوسو اونٹوں کا قافلہ بن جاتا تھا،اب جہاں سو اونٹوں نے آکر مہمان بننا ہوتا تھا تو وہاں وہ کمرے تو نہیں بنا سکتے تھے،اوپن فیلڈ میں ہی ایسا ممکن تھا۔ چناں چہ انہوں نے کہا کہ جو بھی مہمان آتا جائے وہ اس گراؤنڈ میں اپنے خیمے لگاتا جائے۔

مختلف علاقوں کے گورنر صاحبان پہنچنا شروع ہوگئے۔ ہر علاقے کی لباس پہننے کی عادات مختلف ہوتی ہیں۔کہیں کوئی رنگ کہیں کوئی رنگ۔لہذا جب وہ مقررہ دن آیا تو پورے علاقے میں خیمے بھی مختلف رنگوں کے لگے ہوئے تھے اور لباس بھی مختلف رنگوں اور ڈیزائنوں کے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے گلشن سجا ہوا ہو۔

جب سب لوگ آگئے تو بادشاہ نے سب گورنروں کو اپنے دربار میں بلایا۔ جو اچھا کام کرنے والے تھے ان کو انعام دیا اور ڈھیلے تھے ان کی آٹو میٹک تنبیہ بھی ہوگئی کہ انہیں بھی اچھا کام کرنا چاہیے۔ جب محفل برخاست ہوگئی تو بادشاہ نے ہر گورنر کو ایک ایک خلعت (پوشاک) ہدیہ کی۔جس آدمی کو بادشاہ وہ پوشاک دے دیتا تھا تو اس کو بادشاہ کے دربار میں آنے جانے کے لیے اجازت کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ گویا وہ اس وقت کا گرین کارڈ تھا، اسے کوئی دربان روک نہیں سکتا تھا۔وہ جب چاہتا خلعت پہن کر بادشاہ کے ساتھ پرسنل میٹنگ کرلیتا تھا۔وہ اس وقت کی بہت بڑی نعمت ہوتی تھی۔

بادشاہ نے پوشاکیں دے کر کہا کہ کل میں آپ کی اس خلعت دینے کی خوشی میں دعوت کروں گا۔ چناں چہ سب گورنر وہ خلعت پہن کر دعوت کے لیے آئے۔ دعوت کھانے کے بعد پھر محفل لگی۔ بادشاہ اپنے تخت پر بیٹھا اور حالاتِ حاضرہ پر تبادلہ خیالات ہونے لگا۔ اس محفل کے دوران ایک گورنر کو چھینک آنا چاہی۔ اب نہ تو وہ سائنس کا زمانہ تھا اور نہ ہی ان کو امریکن چھینک آتی تھی۔ امریکی لوگ چھینکنے میں بڑے ماہر ہیں، بے شک آپ غور کر کے دیکھ لیں۔ ان کو محفل میں چھینک آتی ہے مگر پتہ ہی نہیں چلنے دیتے۔ ہمیں آج تک اس کی سمجھ نہیں آئی۔ یہ ایسی چیز ہے جو میں Learn کرنا چاہتا ہوں ابھی تک اس کو Learn نہیں کر سکا۔ میں مانتا ہوں کہ واقعی وہ اس میں کمال رکھتے ہیں وہ گورنر صاحب جتنا چھینک کو روکتے کہ نہ آئے اتنا چھینک اور آتی وہ بے چارہ اپنے اندر ہی اندر چھینک کے ساتھ Fight کر رہا تھا۔ بالآخر اس کو دو تین مرتبہ یک دم چھینکیں آئیں۔ چھینک ہے تو ایک قدرتی سی چیز مگر بندے کو اس سے سبکی سی ہو جاتی ہے اور ہر بندہ اس کی طرف دیکھنے لگتا ہے۔ اب جب اس کو چھینکیں آئیں تو اس نے اپنا سر نیچے کر لیا۔ اب لوگوں نے اس کی طرف دیکھا اور پھر بادشاہ کی طرف متوجہ ہو گئے۔ اللہ کی شان کہ جب چھینک آتی ہے تو کئی مرتبہ ناک میں سے پانی بھی آجاتا ہے۔ اس کی ناک میں سے بھی پانی نکل آیا۔ نہ تو اس کے پاس ہماری طرح کا رومال تھا اور نہ کوئی اور انتظام، جس سے ناک کا پانی صاف کرتا، وہ بڑا پریشان ہوا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے سوچا کہ اب تو سب بندوں نے توجہ ہٹا لی ہو گی اس وقت اس نے پوشاک کے اوپر والے کپڑے کے ساتھ اپنی ناک صاف کر لی، جب اس نے خلعت کے ساتھ اپنی ناک صاف کی تو عین اسی لمحے بادشاہ نے اس کی طرف دیکھ لیا۔ بادشاہ کو بڑا غصہ آیا اور وہ کہنے لگا کہ میری دی ہوئی پوشاک کی اتنی ناقدری کہ اس کے ساتھ تو نے اپنی ناک صاف کی ہے۔ چناں چہ اس نے اپنے آدمیوں کو بلایا اور ان سے کہا کہ اس سے پوشاک چھین لو اور بھرے دربار سے اس کو دھکا دے دو۔ کارندوں نے اس

سے پوشاک چھین لی اور دربار سے باہر نکال دیا۔اس کے بعد بادشاہ بھی Serious (سنجیدہ) ہوگیا اور باقی لوگ بھی خاموش ہوگئے۔ وزیر باتدبیر نے کہا کہ بادشاہ سلامت! محفل برخاست کردیں۔ چناں چہ بادشاہ نے محفل برخاست کرنے کا اعلان کردیا۔ سب لوگ اٹھ کر چلے گئے۔اب دربار میں بادشاہ اوراس کا وزیر رہ گئے۔

بادشاہ غصے کی وجہ سے خاموش تھا اور وزیر یہ سوچ رہا تھا کہ میں کوئی ایسی بات کہوں کہ جس کی وجہ سے بادشاہ کا غصہ بڑھنے کی بجائے کم ہوجائے۔ابھی وزیر باتدبیر کوئی بات کرنا ہی چاہتا تھا کہ اتنے میں باہر سے دربان نے آکر کہا کہ بادشاہ سلامت! نہاوند کے علاقے کا گورنر شرف بازیابی چاہتا ہے۔بادشاہ نے کہا پیش کرو۔چناں چہ نہاوند کے علاقے کا گورنر بھی آگیا۔بادشاہ نے پوچھا کیسے آئے؟ کہنے لگا بادشاہ سلامت! میں صرف یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا چھینک بندے کے اختیار میں ہے یا اختیار میں نہیں ہے۔اس نے کہا تم مجھ سے ایسا Silly بے وقوفی والا سوال کرتے ہو۔اس نے کہا بادشاہ سلامت! میرا دوسرا سوال یہ ہے کہ اس گورنر صاحب نے جو آپ کی دی ہوئی پوشاک سے اپنی ناک صاف کی، کیا یہ ضروری تھا کہ اس کو بھری محفل میں رسوا کیا جاتا یا اس کو علیحدگی میں تنبیہ کرکے اس سے خلعت لی جاسکتی تھی؟ کیا اس کی Public insult ضروری تھی؟ یہ سن کر بادشاہ آگ بگولہ ہوگیا۔ پھر کہنے لگا خبردار! تمہارے اس سوال سے محاسبے کی بوآتی ہے، اگر تم نے مزید زبان کھولی تو میں تمہارا بھی وہی حشر کروں گا۔اس نے کہا بادشاہ سلامت! آپ کو حشر کرنے کی ضرورت نہیں ہے، مجھے خود ہی بات سمجھ میں آگئی ہے۔ کہنے لگا تمہیں کون سی بات سمجھ میں آگئی ہے؟ گورنر کہنے لگا کہ آپ نے بھرے دربار میں اسے رسوا بھی کیا اور دھکے دلوا کر باہر بھی نکلوادیا، مجھے یہ بات سمجھ میں آئی ہے کہ میرے پروردگار نے مجھے انسانیت کی پوشاک پہنا کر اس دنیا میں بھیجا ہے، اگر میں اس انسانیت کی پوشاک کی Respect (قدر) نہیں کروں گا تو اللہ تعالیٰ بھی قیامت کے دن بھرے مجمع میں مجھے ذلیل

کر کے باہر نکلوادیں گے۔ بادشاہ سلامت! میں پہلے اس پوشاک کی قدر کرلوں، مجھے آپ کی دی ہوئی پوشاک کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ کہہ کراس نے وہ پوشاک اتاری اور بادشاہ سلامت کی طرف پھینک ماری اور یہ کہہ کر نکل گیا کہ اپنی گورنری اپنے پاس ہی رکھو، میں جارہا ہوں۔ اس طرح اسی وقت اس کے ہاتھ سے گورنری کا عہدہ نکل گیا۔ باہر نکل کراس نے ساتھ آنے والے لوگوں سے کہا کہ وہ اس کے گھر والوں کو گھر پہنچادیں اورادھر گھر والوں کو بھی پیغام پہنچادیا کہ میں اس مقصدِ زندگی کو سمجھنے کے لیے جارہاہوں جس کو میں اب تک بھولا ہوا تھا۔

اس زمانے میں حضرت سراج رحمۃ اللہ علیہ ایک مشہور بزرگ تھے۔اس نے سوچا کہ میں ان کے پاس جاتا ہوں۔ چناں چہ وہ سیدھا ان کے پاس چلا گیا۔ وہاں پہنچ کر حضرت سے کہنے لگا، حضرت! میں انسان بننا چاہتا ہوں اس لیے مجھے آپ انسانیت سکھادیجئے۔انہوں نے فرمایا کہ ٹھیک ہے، ہمارے پاس رہو تمہیں اپنا گوہرِ مقصود مل جائے گا۔ چوں کہ وہ گورنر رہا تھا اور ابھی تک اصلاحِ نفس نہیں ہوئی تھی اس لیے اس کے کاموں میں اور باتوں میں تیزی تھی۔ چناں چہ انہوں نے ذرا ذرا سی بات پر تیزی دیکھ کر سوچا کہ اس بندے کو سنبھالنا آسان کام نہیں ہے۔لہذا انہوں نے چند دنوں کے بعد فرمایا بھئی! یہ خلعت تمہیں بغداد سے ملے گی۔ وہاں پر جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کے نام سے ایک بزرگ ہیں تم ان کے پاس چلے جاؤ۔اس نے کہا بہت اچھا۔ چناں چہ اس بندے نے سفر کیا اور حضرت جینید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس پہنچ گیا۔ وہاں جا کر اس نے حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے کہا، جی آپ کے پاس ایک نعمت ہے، میں اس کو لینے کے لیے حاضر ہواہوں، اگر آپ چاہیں تو میں اس نعمت کی قیمت ادا کردوں گا۔ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ پہلی بات تو یہ ہے کہ اگر ہم آپ سے قیمت لیں تو آپ دے نہیں سکتے یعنی اگر محنت کروائیں تو تم محنت نہیں کرسکتے اور اگر بغیر قیمت کے تمہیں دے دیں تو تمہیں اس کی قدر نہیں ہوگی۔اس نے عرض کیا حضرت! پھر کیا صورت بنے گی؟ حضرت نے فرمایا کہ یہیں رہو،

دیکھیں کہ اللہ تعالیٰ کیا صورت پیدا کرتے ہیں۔ چناں چہ انہوں نے وہیں رہنا شروع کر دیا۔

کچھ عرصہ رہنے کے بعد ایک دن حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو بلایا اور پوچھا کہ تم کیا کام کرتے ہو؟ اس نے عرض کیا، حضرت! میں نہاوند کے علاقے کا گورنر تھا۔ حضرت نے فرمایا، اچھا۔ اب وہ سمجھ گئے کہ اس گورنر کے دماغ میں سے ''میں'' نکالنی پڑے گی کیوں کہ یہ گورنر بھی چھوٹے سے خدا بنے ہوتے ہیں۔ چناں چہ انہوں نے فرمایا کہ بغداد کے بازار میں جا کر گندھک کی دکان بنالو۔ اب کہاں گورنر اور کہاں گندھک کی دکان۔ گندھک کی دکان میں سے عجیب طرح Smell (بو) آتی ہے اور اسے خریدنے والے لوگ اتنے پڑھے لکھے نہیں ہوتے۔ ان کی Deelings بھی بہت ہی Rough قسم کی ہوتی ہے۔ یہ ایسے ہی تھا جیسے کسی ملک کے صدر سے کہا جائے کہ تم کریانہ کی دکان بنالو۔ اس زمانے میں گندھک کا استعمال بہت زیادہ تھا۔ حتیٰ کہ کپڑے دھونے میں بھی استعمال ہوتی تھی۔ جب حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے اسے گندھک کی دکان کے بارے میں کہا تو اسے بہت عجیب لگا۔ لیکن چوں کہ شیخ نے فرمایا تھا اس لیے کہنے لگے کہ حضرت! ٹھیک ہے میں گندھک کی دکان کھولتا ہوں۔ چناں چہ انہوں نے ایک سال تک گندھک کی دکان چلائی۔ وہ بے چارے گنتے رہے کہ کب دن پورے ہوتے ہیں۔

جب ایک سال پورا ہوا تو کہنے لگے، حضرت! آپ نے فرمایا تھا کہ ایک سال گندھک کی دکان چلاؤ، وہ ایک سال پورا ہو گیا ہے۔ حضرت نے فرمایا، اچھا تم دن گنتے رہے ہو، چلو ایک سال اور یہی دکان چلاؤ۔ چناں چہ جب اس دفعہ گئے تو دن گننے چھوڑ دیئے۔

دوسرا سال گزرنے کے بعد حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ نے ان سے فرمایا، بھئی اب تو ایک سال سے زیادہ عرصہ گزر گیا ہے، لگتا ہے کہ تم نے دن گننا بھی چھوڑ دیئے ہیں۔ چناں چہ انہوں نے واپس آ کر عرض کیا، حضرت! اب میرے لیے کیا حکم ہے؟ حضرت نے انہیں ایک پیالہ پکڑایا اور فرمایا کہ بغداد کے شہر میں جا کر بھیک مانگو اور جو کچھ تمہیں ملے وہ خانقاہ کے فقیروں

کولا کر کھلا دینا، تم نے خود نہیں کھانا۔ خود روزے رکھو اور بھیک مانگو۔ اللہ اکبر

اب ایک علاقے کا گورنر بھیک مانگنے کے لیے کیسے تیار ہوا ہوگا۔ وہ شکل وصورت سے تو بڑے پڑھے لکھے اور صحت مند لگتے تھے۔ لہذا سوچ میں پڑ گئے۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: اگر تمہارے دل میں اس نعمت کی طلب ہے تو جو کام کہہ دیا ہے کرو ورنہ یہاں سے چلے جاؤ۔

انہوں نے پیالہ ہاتھ میں پکڑا اور بازار جا کر صدا لگائی کہ اللہ کے نام پر کچھ دے دو۔ اب جس سے بھی وہ بھیک دینے کی درخواست کرتے، اسے وہ اچھے خاصے صحت مند لگتے تھے۔ چناں چہ وہ کہتا کہ ''شرم نہیں آتی، اچھے بھلے ہوتے ہیں اور مانگنے آ جاتے ہیں، کام چور کہیں کے، چلو میاں یہاں سے چلے جاؤ'' جب ایک ڈانٹ پلایا تو دوسرے کے پاس چلے جاتے۔ وہ بھی ڈانٹ پلا دیتا۔ شیخ کا اصل مقصد بھی یہی تھا کہ جب یہ مخلوق کی ڈانت ڈپٹ سنیں گے تو ان کو اپنی اوقات کا پتہ چلے گا کہ میں کیا ہوں۔ وہ جس سے بھی بھیک مانگتے تھے وہی آگے سے کھری کھری سناتا جس کی وجہ سے ان کی خوب رسوائی ہوتی تھی۔ اسی طرح انہیں روزانہ دھتکارا جاتا اور کوئی بھی ان کو کچھ نہ دیتا تھا۔ کچھ دنوں کے بعد لوگوں کو بھی پہچان ہوگئی کہ یہ پھرتا رہتا ہے۔ چناں چہ وہ دور سے دیکھتے ہی اسے کوسنا شروع کر دیتے۔ اب ان کے لیے ان لوگوں کے سامنے جانا بھی مشکل ہوگیا تھا۔

ایک سال بھیک مانگنے کی وجہ سے ان کا ''من'' اتنا صاف ہوگیا کہ انہیں مخلوق کے تعلق سے نجات مل گئی۔ اگر شیخ کسی کو تنہائی اختیار کرنے کو کہیں یا کسی کو کہیں کہ تم فلاں شخص سے نہ ملو تو اس سے ان کی نظر میں اصل مقصود انقطاع من المخلوق ہوتا ہے۔ اور یہ قرآنی فیصلہ ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

واذکر اسم ربک وتبتل الیه تبتیلا۔ (المزمل:۸)

اور ذکر کر اپنے رب کے نام کا سب سے ہٹ کٹ کر

ایک دن حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ بلا کر کہا کہ گورنر صاحب! آپ کا نام کیا ہے؟

عرض کیا ابوبکر شبلی۔ فرمایا: اچھا اب آپ ہم محفل میں بیٹھا کریں۔ گویا تین سال کے مجاہدے کے بعد اپنی مجلس میں بیٹھنے کی اجازت دی۔ چوں کہ شبلی رحمۃ اللہ علیہ کا دل پہلے ہی صاف ہو چکا تھا اس لیے اب حضرت کی ایک ایک بات سے سینے میں نور بھرتا گیا اور آنکھیں بصیرت سے مالا مال ہوتی گئیں۔ چند ماہ کے اندر اندر احوال و کیفیات میں ایسی تبدیلی آئی کہ دل محبتِ الٰہی سے لبریز ہو گیا۔

بالآخر حضرت جنید بغدادیؒ نے ایک دن بلایا اور فرمایا شبلی! آپ نہاوند کے علاقے کے گورنر رہے ہیں، آپ نے کسی سے زیادتی کی ہوگی اور کسی کا حق دبایا ہوگا، لہذا آپ ایک فہرست مرتب کریں کہ آپ نے کس کس کا حق پامال کیا ہے، آپ نے فہرست بنانا شروع کر دی۔ ساتھ حضرت کی توجہات بھی تھیں، چناں چہ تین دن میں کئی صفحات پر مشتمل طویل فہرست تیار ہو گئی۔ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ باطن کی نسبت اس وقت تک نصیب نہیں ہو سکتی جب تک کہ معاملات میں صفائی نہ ہو۔ لہذا جاؤ ان لوگوں سے حق معاف کروا کے آؤ۔ چناں چہ آپ نہاوند تشریف لے گئے اور ایک ایک آدمی سے معافی مانگی۔ بعض نے تو جلدی معاف کر دیا، بعض نے کہا تم نے ہمیں بہت ذلیل کیا تھا لہذا ہم اس وقت تک معافی نہیں دیں گے جب تک تم اتنی دیر دھوپ میں نہ کھڑے رہو۔ بعض نے کہا کہ ہم اس وقت تک معاف نہیں کریں گے جب تک ہمارے مکان کی تعمیر میں مزدور بن کر کام نہ کرو۔ آپ ہر آدمی کی خواہش کے مطابق اس کی شرط پوری کرتے اور ان سے حق بخشواتے رہتے حتی کہ دو سال کے بعد واپس بغداد پہنچے۔

اب آپ کو خانقاہ میں آئے ہوئے پانچ سال کا عرصہ گزر گیا تھا۔ مجاہدے اور ریاضت کی چکی میں پس پس کر نفس مر چکا تھا۔ ''میں'' نکل گئی تھی۔ باطن میں تو ہی تو کے نعرے تھے۔ پس رحمتِ الٰہی نے جوش مارا اور ایک دن حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ نے انہیں باطنی نسبت سے مالا مال کر دیا۔ بس پھر کیا تھا

آنکھ کا دیکھنا بدل گیا۔

پاؤں کا چلنا بدل گیا۔

دل و دماغ کی سوچ بدل گئی۔

غفلت کے تار پود بکھر گئے۔

معرفتِ الٰہی سے سینہ پرنور ہو کر خزینہ بن گیا اور آپ عارف باللہ بن گئے۔

واقعی جو بندہ اللہ رب العزت کے لیے مشقتیں برداشت کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی ایسی رہنمائی فرماتے ہیں کہ وہ اپنے گوہر مقصود کو پا لیتا ہے۔ اسی لیے اللہ رب العزت ارشاد فرماتے ہیں:

والذین جاھدوا فینا لنھدینم سبلنا. (العنکبوت:۶۹)

اور جو بندے ہمارے راستے میں مجاہدہ کرتے ہیں ہم ان کو نئی نئی راہیں سجھاتے رہتے ہیں۔

ویسے بھی اللہ تعالیٰ کا قرآنی فیصلہ ہے کہ

لیس للانسان الا ما سعیٰ(النجم:۳۹)

انسان کے لیے وہی کچھ ہے جس کے لیے وہ کوشش کرتا ہے۔

اس عظیم مجاہدے کی وجہ سے حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ پر اللہ رب العزت کی طرف سے انعامات کی خوب بارش ہوئی۔ ان کے دل میں اللہ رب العزت کی ایسی محبت پیدا ہوئی کہ جو شخص بھی آپ کے سامنے اللہ تعالیٰ کا نام لیتا تھا آپ اس کے منہ میں شیرینی ڈال دیتے تھے۔ ایک شخص نے اس کی وجہ پوچھی تو فرمایا کہ جو شخص میرے محبوب کا نام لے میں اس کے منہ میں شیرینی سے نہ بھر دوں تو اور کیا کروں۔ جی ہاں جن لوگوں نے اپنے نفس کو ریاضت کی بھٹی میں ڈال کر کندن بنایا ہوتا ہے ان کے دلوں میں اللہ تعالیٰ کی محبت کا سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگتا ہے۔

☆☆☆

مومن فقط احکامِ الٰہی کا ہے پابند

حضرت مولانا عبدالاحد صاحب ازہری ناظم معہد ملت

مسلمانوں کے شخصی قوانین اور عائلی نظام سے متعلق بار بار اس بات کا واشگاف طور پر اعلان کیا جاتا رہا ہے کہ اس پر براہ راست یا متوازی قانون سازی کے ذریعہ دست اندازی نہیں کی جاسکتی، یہ قوانین قبائلی اور خاندانی رسم ورواج یا بزرگوں اور انسانی عظیم ہستیوں کا وضع کردہ نہیں ہیں، بلکہ یہ اسلامی شریعت کا ایک جزولاینفک اور خالق کائنات کی طرف سے قائم کردہ حدود ہیں، یہ اسلام کے عطا کردہ مکمل نظام حیات کے اٹل قوانین فطرت ہیں ان کا واضع اور مقرر کرنے والا وہی قادر مطلق ہے، ایک حلقہ بگوش اسلام کے ایک لمحہ کے لیے بھی اس بات کی اجازت نہیں دی جاسکتی کہ وہ اسلام کی عمل داری سے روگردانی اور اللہ کی قائم کردہ حدود سے انحراف اور سرکشی کرے۔ اگر کوئی جانتے بوجھتے اس قسم کا عمل واقدام کرے گا تو پھر اس کو اپنے ایمان واسلام کی خیر منانا چاہیئے۔

۱۹۷۲ء کے گردوپیش کے حالات کا جائزہ لینے کے بعد جب اس بات کا شدید خدشہ لاحق ہوا کہ کہیں حکومت نام ونہاد مسلمانوں اور اپنے خوشامدی جعفران ملت کا سہارا لے کر قوانین شریعت اور احکامِ الٰہی کو متوازی قانون سازی کے ذریعہ ختم کرنیکی جرأت نہ کرسکے، ایوانِ حکومت کے اندر اور باہر اس قسم کی زہر پاشی کی جانے لگی، سرعام دشمنان دین وملت اسلام کو مطعون کرنے لگے تو ملت کے ہر مکتب فکر وخیال کے علماء زعماء اور قائدین بمبئی میں اکٹھا ہوئے، اس موقعہ پر پوری ملت نے بے نظیر اتحاد اور بے مثال جمعیت کا مظاہرہ کیا، ایک ہی اسٹیج پر شیعہ وسنی، دیوبندی وبریلوی، وہابی واہل حدیث اور بوہرے ورضائی قدم بقدم اور شانہ بشانہ نظر

آئے اور تمام عمائدین نے بیک آواز حکومت اور عوام دونوں کو اپنا اٹوٹ اور انمٹ فیصلہ سنا دیا کہ:

تقدیر کے پابند نباتات وجمادات

مومن فقط احکامِ الٰہی کا ہے پابند

اس واشگاف اور دوٹوک اعلان کے بعد حکومت نے بھی ہوش کی آنکھیں کھولیں اور عقل کے ناخن لیے اور یہ مکارانہ اعلان کیا کہ حکومت مسلمانوں کے پرسنل لا میں اس وقت تک کوئی مداخلت نہ کرے گی جب تک خود مسلمان اس کا مطالبہ نہ کریں، حکومت کے نہاں خانہ دل میں شاید یہ ناپاک ارادہ موجزن رہا ہو کہ ہم اپنی طاقت وحکومت، بے پناہ دولت، اور بے تحاشہ عددی قوت وطاقت کے بل بوتے لاکھوں نہیں بلکہ کروڑوں مسلمانوں کو اپنا ہم خیال اور ہم نوا بنالیں گے، اور پھر مسلمان ہی میں سے ہزاروں جعفروں اور صادقوں کے ذریعہ یہ مطالبہ کروادیں گے کہ مسلم پرسنل لا کی جگہ مشترکہ سول کوڈ کا نفاذ ہونا چاہئے، اور معاذ اللہ مسلمانوں کے شخصی قوانین کو غیر معقول اور پرانے زمانے کی یادگار بنادیں گے، اور خصوصیت سے چند زوجیت کو نشانہ بنا کر خود مسلمانوں کی ہی طرف سے یہ آواز بلند کروادیں گے کہ حکومت بلا تاخیر مشترکہ سول کوڈ بنائے اور مسلمانوں کی پرواہ نہ کرے۔

مسلم عمائدین اور ملی قائدین نے ایک سرگرم فعال اور متحرک بورڈ بنادیا ہے جو مسلم پرسنل لا اور قانون شریعت کے تحفظ کے لیے ہمہ وقت چاق وچوبند اور بیدار رہتا ہے، جس کا اثر یہ ہوا کہ حکومت اپنے عزائم میں کامیاب وکامران نہ ہوسکی۔ تاہم وہ پورے طور پر مایوس بھی نہیں ہوئی ہے، بلکہ وقفہ وقفہ سے بدل بدل کر ایسے افراد اور جماعتوں کو منظر عام پر لاتی رہی ہے اور لاتی رہتی ہے اور خطرہ ہے کہ آئندہ بھی یہ سلسلہ باقی رہے گا، جو قوانین شریعت کے خلاف زبان درازی اور ان میں میخ مین نکالنے کی مذموم حرکت کرتے رہتے ہیں۔ اس لیے افراد امت اور

فرزندان ملت کو سب خیریت ہے سمجھ کر چادر تان کر نہ سونا چاہئے، بلکہ شریعت کی بقاء شخصی قوانین کے تحفظ اور دین واسلام کے احیاء کے ہر وقت چوکس رہنا لازمی ہے۔

اسی قسم کا یک بھونڈا مظاہرہ ابھی حال میں گذشتہ دنوں مالیگاؤں میں ہوا، جس سے مسلمانوں کی شدید دل آزاری ہوئی ہے، مالیگاؤں جتنا پارٹی کی طرف سے مظلومین آسام کی ہمدردی اور وہاں کی دہشت زدہ اور وحشت وبربریت کے شکار عوام کی غم خواری میں حکومت آسام کی ناکامی پر مذمتی جلسہ لیا گیا تھا، چوں کہ آسام کی دلدوز صورت حال نے ہندوستان کے سارے انصاف پسند اور حقیقت شناس عوام، کیا ہندو اور کیا مسلمان، کیا سکھ اور کیا پارسی ہر ایک کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہے، ہر محبّ انسانیت آسام میں انسانیت کی پامالی، معصوم بچوں اور بے گناہ عورتوں کے سفاکانہ قتل اور غارت گری پر نوحہ گر اور ماتم کناں ہیں، اس لیے اس جلسہ میں خلاف توقع کثیر تعداد میں لوگوں نے شرکت کی۔ دو روز قبل ہی لاؤڈ اسپیکر کے ذریعہ پورے شہر اور اطراف واکناف میں جلسہ کی تشہیر اور خوب خوب پروپیگنڈہ کیا گیا تھا، لیکن اس وقت عوام بالخصوص مسلمانوں کی امیدوں پر پانی پھر گیا ان کے حوصلے سرد پڑ گئے۔

جب پونہ سے آئی ہوئی ایک گمنام، نام نہاد مسلم خاتون سلمیٰ قیومی نے مظلومی آسام کے پردے میں شرعی قوانین پر گل افشانی شروع کی۔ اس موقع پر اس خاتون نے دانستہ اسلام کے خلاف جس جاہلانہ چرب زبانی کا ثبوت دیا وہ خود اس کے لیے قابل عبرت ہونا چاہئے، اس خاتون نے دانستہ اسلام کے احسانات اور شریعت کی خصوصیات سے روگردانی کرتے ہوئے کہا کہ بھائیو صرف آسام ہی میں ظلم نہیں ہو رہا ہے، بلکہ اسلام کے قانون طلاق کے ذریعے عورتوں پر مسلسل ظلم ہو رہا ہے، ہم اس خاتون کے حدود اربعہ نہیں جانتے اور نہ اس کی سرگرمیوں سے پورے طور پر واقف ہیں۔ ہاں مگر اتنا ضرور یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ یہ بھی اپنے پیش رو چھاگلہ اور حمید دلوائی کی طرح کسی کی کٹھ پتلی ہے، اس خاتون کی اس کی دانست میں مسلم سماج کی ایک

خرابی نظر آئی جس کے اوپر وہ واویلا مچا رہی ہے، لیکن اس کو ہندوستانی سماج میں جہیز کی برائیاں اور تلک کی لعنتیں نظر نہیں آتیں، چھوت چھات اور ذات برادری کا امتیاز جس نے کروڑوں انسانوں کی انسانیت کی سطح سے بھی نیچے گرا رکھا ہے، اس کی خامیاں اور نقائص نظر نہیں آتے، کیا کبھی ان خامیوں کمزوریوں اور برائیوں کے خلاف نعرۂ جہاد زبان پر آیا۔ آپ تحقیق کرنے جائیں گے تو آپ کو سخت مایوسی ہوگی۔ یہ کیسے مصلح ریفارمر ہیں جن کو صرف مسلمانوں کے شخصی قوانین ہی کی برائیاں نظر آئیں اور اسی کو دیکھ دیکھ کر ان بیچاروں اور بیچاروں کے خون خشک ہو رہے ہیں، اور دبلے ہوتے جا رہے ہیں، ان کو مسلم کشی کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ نظر نہیں آتا۔ ملازمتوں اور سرکاری عہدوں میں ان کے ساتھ ناانصافیاں نہیں دکھتیں۔ اکثریتی فرقہ میں کئی کئی طاقتور تنظیمیں نظر آتیں۔ جن کا صبح وشام کا کام یہ ہے کہ مسلمانوں کے خلاف نفرت ودشمنی کا بازار اور خوف ودشت کی ہوائیں گرم رکھیں۔ اگر دل میں اخلاص ہے تو پھر یہ مسائل ومعاملات بھی دعوت اصلاح وجہاد دے رہے ہیں، ادھر سے کیوں آنکھیں بند ہیں، صرف طلاق اور تعدد زوجیت اور یہی چند مسائل کیوں نظر آتے ہیں شاید کوئی دوسرا ہی معشوق اس پردۂ زنگاری میں مستور ہے۔

مذکورہ خاتون تو خیر نام کی مسلمان ہے اور یہ نام ہی کچھ نہ کچھ فائدہ ضرور پہونچا دیتا ہے، نام ہی کی برکت ہے کہ مسلمانوں نے اس پر آبرو باختگی کا الزام نہیں لگایا، اور نہ ہی بائیکاٹ کیا تاہم اس ہندوستان میں ابھی ماضی قریب میں ایسے انصاف پسند رہنما اور لیڈر گذرے ہیں جنہیں اگر چہ اسلام کا سایۂ عاطفت اور آغوش شفقت نصیب نہیں ہوا، لیکن انہوں نے اسلام کے احسانات کو فراموش نہیں کیا، اور جب کبھی موقعہ ملا برملا اس کا اعتراف واقرار کیا۔ چناں چہ آزاد بھارت کے پہلے وزیراعظم پنڈت جواہر لال نہرو اپنی شہرۂ آفاق کتاب ''ڈسکوری آ انڈیا'' میں ایک جگہ رقم طراز ہیں اسلام کی آمد ہندوستان کی تاریخ میں کافی اہمیت رکھتی ہے، اس نے ان

خرابیوں کو جو ہندو سماج میں پیدا ہوگئی یعنی ذاتوں کی تفریق، چھوت چھات اور انتہا درجہ کی علاحدگی پسندی کو واضح کر دیا، اسلام کے اخوت کے نظریئے اور مسلمانوں کی عملی مساوات نے ہندوؤں کے ذہن پر بہت گہرا اثر ڈالا خصوصاً وہ طبقہ جو ہندو سماج میں نابرابری کی اذیت کا شکار تھا اس سے بہت متاثر ہوا۔

ہم جنتا پارٹی کے پلیٹ فارم سے تقریر کرنیوالی اس نام نہاد مسلم خاتون کی حد درجہ دل آزار تقریر پر شدید رنج وغم کا اظہار اور پرزور الفاظ میں مذمت کرتے ہیں اس خاتون نے ایک ایسی فضا میں جب کہ اہنسا کے اس دیش میں تعصب وفرقہ پرستی، نفرت وعلاحدگی پسندی تشدد اور بربریت کا دیو چاروں کھونٹ آزاد ننگا رقص کر رہا ہے، مسلمانوں کے زخموں پر نمک پاشی کی ہے، اس وقت ضرورت اس بات کی تھی اور ہے کہ تمام پرستاران انسانیت اور محافظان آدمیت اس بارود کو ٹھنڈا اور بے کار کرنے کی کوشش کرتے، جس کی تہیں پورے ملک میں بچھی ہوئی ہیں، اور جس کے دھماکے ایک تسلسل کے ساتھ جہاں تہاں ہو رہے ہیں، آسام کے قتل عام پر کچھ نہ کہا جائے جس نے ہماری گردنیں شرم سے جھکادی ہیں، اس شرمناک اور انسانیت سوز واقعہ سے پہلوتہی کرتے ہوئے اس نازک مسئلہ پر تیشہ زنی کی جسارت کرنا حد درجہ افسوس ناک ہے، جو مسلمانوں کے نزدیک ان کے جان ومال اور ان کے اہل وعیال سے زیادہ قیمتی اور سرمایۂ فخر وامتیاز ہے، یعنی ان کا دین وایمان، مسلم پرسنل لاء کا تعلق دین وایمان سے ہے، لہذا اس سے مسلمان کبھی دست بردار نہیں ہوسکتے، ہم حمید دلوائی کی اس بہن کے ساتھ اس پارٹی کی بھی مذمت کرتے ہیں جس نے مسلمانوں کی دل آزاری کے لیے ایسے لوگوں کو مالیگاؤں میں مدعو کیا۔

☆☆☆

خبرنامہ

کیا اس سال ریکارڈ ٹوٹ جائے گا؟ فروری میں ہی گرمی محسوس ہونے لگے گی۔

محکمہ موسمیات کے مطابق دہلی اوراطراف کی ریاستوں میں درجہ حرارت ابھی سے ۳۰؍ڈگری کے قریب پہنچ گیا

نئی دہلی (ایجنسی) قومی راجدھانی دہلی سمیت شمالی ہندوستان کی زیادہ تر ریاستوں میں فروری کے دوسرے ہفتے میں موسم کا مزاج بدل گیا ہے۔ ان میں تیز چمکتی دھوپ کے ساتھ گرمی کا احساس ہونے لگا ہے۔ گزشتہ ۳؍روز سے تیز ہواؤں کے تھمنے کے بعد دوپہر کی دھوپ تیز محسوس کی جارہی ہے۔ شمالی ہندوستان کی ریاستوں میں درجہ حرارت مسلسل بڑھ رہا ہے۔ اگر یہی حال رہا تو فروری کے ختم ہونے کے پہلے ہی ہولی کے بعد والی گرمی کا احساس ہونے لگے گا۔ محکمہ موسمیات (آئی ایم ڈی) اوراسکائی میٹ ویدر کی تازہ پیش گوئی کے مطابق فروری ماہ معمول سے زیادہ گرم رہنے والا ہے۔ دہلی-این سی آر کے کئی علاقوں میں درجہ حرارت ۲۸؍سے زیادہ ۳۰؍ڈگری تک پہنچ رہا ہے جو فروری کے حساب سے زیادہ ہے۔

شمالی ہندوستان کی زیادہ تر ریاستوں میں فروری کی شروعات میں ہی زیادہ سے زیادہ درجہ حرارت ۱۸؍ڈگری کے اوسط سے بڑھ کر ۲٦؍ڈگری پہنچ چکا ہے۔ واضح رہے کہ ۱۱؍فروری کو بھی دہلی میں آسمان صاف ہے۔ کم از کم درجہ حرارت ۱۲؍ڈگری کے آس پاس اور زیادہ سے زیادہ ۲۸؍ڈگری تک رہ سکتا ہے۔ جب کہ پنجاب، ہریانہ، راجستھان اور اتر پردیش کے میدانی علاقوں میں بھی درجہ حرارت تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ ماہرین موسمیات کا کہنا ہے کہ اس بار موسم سرما جلد رخصت ہورہا ہے اور فروری کے اخیر تک گرمی میں اضافہ ہوسکتا ہے۔ ممبئی، چنئی اور منگلور جیسے شہروں میں فروری میں ہی گرمی نے دستک دے دی ہے۔ ممبئی میں اس وقت زیادہ سے زیادہ درجہ حرارت ۳۳؍سے ۳۵؍ڈگری کے قریب پہنچ گیا ہے، جو معمول سے ۴؍ڈگری زیادہ ہے۔ جنوبی ہندوستان میں بھی کم سے کم درجہ حرارت ۲۱/۲۲؍ڈگری کے آس پاس رہا ہے، جس کی وجہ سے راتیں بھی گرم لگ رہی ہیں۔ محکمہ موسمیات کا کہنا ہے کہ فروری میں ملک کے زیادہ تر حصوں میں کم سے کم اور زیادہ سے زیادہ درجہ حرارت معمول سے زیادہ رہنے کا امکان ہے۔..................

(بشکریہ روزنامہ انقلاب، ممبئی ۱۲؍فروری ۲۰۲٦ء)